کے مغنی شعرا کا مختصر تعارف اور ان کے کلام کی تلمیحات اور تاریخی اشاروں کی وضاحت کی گئی ہے، اور شروع میں ہندوستانی زبان میں لکھا گیا ایک مبسوط مقدمہ بھی ہے، اس میں ہندوستان کی مختلف زبانوں خصوصاً اردو، ہندی اور ہندوستانی اور ان کی شاعری کے متعلق مفید معلومات تحریر کیے گئے ہیں، انتخاب سلیقہ اور محنت سے کیا گیا ہے اور اس سے اردو ہندی شاعری پر مصنف کی وسعتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے،

دیوان ناطق:- مرتبہ جناب محمد عبد الحلیم صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۲۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت دس روپیہ
پتہ: محمد عبد الحلیم قدوائی روڈ، مومن پورہ، ناگ پور نمبر ۱ مہاراشٹر۔

سید ابو الحسن ناطق گلاؤٹھی مرحوم اردو کے اچھے ادیب و شاعر تھے، ان کے ابتدائی دور کی نظموں کا ایک مجموعہ بہت پہلے چھپا تھا، مگر اس کے بعد کے کلام کا زیادہ حصہ تلف ہوگیا، اور جو باقی رہا وہ ادھر ادھر منتشر حالت میں تھا، کچھ عرصہ پہلے جناب ناطق مرحوم کے ایک قدر داں جناب عبد الحلیم نے ان کے مضامین و مکتوبات کا ایک مجموعہ اور دیوان غالب کی شرح کنز المطالب شائع کی تھی، اور اب منتشر کلام کو جمع کرکے شائع کیا ہے، یہ دو سو غزلوں، کچھ نظموں، سہروں، نغمیوں، رباعیوں، متفرق اشعار اور قطعات وغیرہ پر مشتمل ہے، شروع میں مرتب کے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں ناطق کے خاندانی حالات ان کی تعلیم اور عام واقعات زندگی کے علاوہ ادبی کمالات اور تصنیفات کا ذکر ہے، انھوں نے یہ دیوان شائع کرکے ایک ادبی خدمت انجام دی ہے، جو لائق تحسین ہے،

"ض"

جلد ۱۲۳ ماہ رجب المرجب ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۹ء عدد ۶

مضامین

شذرات

مولانا محمد علی جوہر کی وفات حسرت آیات کو اڑتالیس برس ہو گئے، اُن کی صد سالہ سالگرہ ہندوستان اور پاکستان میں بڑی عقیدت سے منائی گئی، سیمینار بھی ہوئے کانفرنسیں بھی ہوئیں رسالوں اور اخباروں کے نمبر بھی شائع کئے گئے، اُن کی خدمت کا اعتراف بڑی عقیدت، عزت، اور محبت سے کیا جارہا ہے، وہ خود کہہ گئے تھے،

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر — مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

اُن کی سیاسی سرگرمیوں کی تاریخ یہ ہے کہ وہ کبھی لائڈ جارج، کبھی لارڈ ریڈنگ، کبھی ریمزے میکڈانلڈ، کبھی ابن سعود، کبھی مصطفےٰ کمال، کبھی گاندھی جی، کبھی موتی لال نہرو، کبھی کسی عالم، کبھی کسی اڈیٹر، اور اپنے کسی مخلص ترین دوست سے لڑتے، مگر اپنی ان لڑائیوں میں وہ ترکی میں خلافت کو نہ بچا سکے، حجاز میں شرعی جمہوریت قائم نہ کرا سکے، ہندوستان میں مسلمانوں کو اُن کے حقوق نہ دلا سکے، ساردا ایکٹ کو منسوخ نہ کرا سکے، ہندو مسلم اتحاد قائم نہ کرا سکے، پھر ہندوستان کی آزادی بھی اُن کی زندگی میں حاصل نہیں ہوئی جس کے لئے اپنی جان کی بازی لگا رکھی تھی، اس لئے ظاہر بینوں کو انھوں نے جیتے جی کچھ نہ دکھلایا، مگر جس شان اور آن بان سے وہ مختلف مورچوں پر لڑائیاں لڑتے رہے وہی ان کا اصلی کارنامہ ہے، اُن کی زندگی سے یہ پیام ملتا ہے کہ لڑائی میں دہکتی ہوئی رزمیہ ہوئی اور خمیرا در دہکتے ہوئے چہرے کے ساتھ پسپائی ہو جائے، تو صحیح معنوں میں یہی فتح و کامرانی ہے،

اُن کی قیادت سے ہم کو یہ درس ملا ہے کہ ایک قائد میں ہمت مردانہ ہو، انداز قلندرانہ ہو، شاہین کا جگر، اور چیتے کا کلیجہ ہو، اور وہ جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا جانتا ہو تو ظاہری فتح و کامرانی نہ بھی ہو مگر اس سے دن کانپ سکتا ہے، غنیموں کے دل دہل سکتے ہیں، انکی صف شکنی ہو سکتی ہے، پست حوصلے بلند رکھے جا سکتے ہیں،

آج ہم مسلمانوں میں کون ایسا جری ہے کہ جو یہ بانگ دہل کہہ سکے کہ جہاں تک خدا کے احکام کی تعمیل کا تعلق ہے میں اوّل مسلمان ہوں بعد میں مسلمان ہوں، آخر میں مسلمان ہوں اور کچھ بھی نہیں صرف مسلمان ہوں، مگر جہاں تک ہندوستان کی فلاح و بہبود کا تعلق ہے میں پہلے ہندوستانی ہوں آخر میں ہندوستانی ہوں، اور کچھ بھی نہیں، صرف ہندوستانی ہوں،

انھوں نے یہی مسلک ہندوستانی مسلمانوں کو اختیار کرنا سکھایا، اس میں کوئی نقص نہیں، محب مذہب ہی محب وطن ہو سکتا ہے، مذہب سیاست کو خراب نہیں کرتا، سیاست مذہب کو آلودہ کرتی ہے، گاندھی جی مہاتما بن کر دلوں پر حکمرانی کرتے رہے، وہ بہترین ہندو اور بہترین وطن دوست تھے، ہندو مت کے پجاری بن کر ہندوستان کے بھی پجاری ہوئے، مسلمانوں میں کچھ رہنما ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ پہلے ہندوستانی ہیں، پھر مسلمان ہیں، یہ رہنما زیادہ تر ایسے ہیں جو اپنے ذاتی مفاد اور مصالح کی خاطر پہلے ہندوستانی اور پھر بعد میں مسلمان بنتے ہیں، مگر جب اُن کی ذاتی غرض پوری ہو جاتی ہے تو وہ نہ ہندوستانی اور نہ مسلمان باقی رہتے ہیں، اُن کی حیثیت جرمن سلور کی ہو جاتی ہے، جو نہ جرمن ہوتا ہے اور نہ سلور،

مولانا محمد علی کا سیاسی نظریہ یہ تھا کہ ایک اچھے رہنما کے لئے ضروری ہے، کہ وہ پہلے اپنے نفس کی تربیت کرے، پھر اپنے خاندان اور کنبے والوں کو تنظیم کرے، کیونکہ منظم کنبوں اور خاندانوں کے بغیر نہ ایک ملت اور نہ ایک قوم کی تنظیم ہو سکتی ہے، جو شخص اپنے خاندان اور کنبہ کی تنظیم نہیں کر سکتا وہ اپنی ملت کے سود و بہبود کے لئے کچھ نہیں کر سکتا، وہ بھلا قوم اور ملک کے لئے کیا کر سکتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اس ارتقا کی ہر منزل میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس منزل سے آگے بھی منزلیں ہیں، آخر میں نہ فقط اپنا نفس ہے نہ اپنا کنبہ ہے، نہ اپنی ملت ہے نہ اپنی قوم ہے، بلکہ بنی نوع انسان ہے اور اس سے بھی آگے مخلوق اور کائنات ہے،

اس طرح مولانا محمد علی کی قیادت، ملیت، قومیت اور خدمت انسانیت کے اعلیٰ اور ارفع تخیلات پر مبنی تھی وہ اپنی ملت اور اپنی قوم کی خدمت کی منزلیں طے کر رہے تھے کہ اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی، انھوں نے

ان دونوں کی خدمت میں جو بہار آفریں آمیزش پیدا کی، وہ ہندوستان کے موجودہ مسلمان رہنماؤں کے لئے مثال ہو کہ امتِ محمدیہ کے لئے سوگوار رہ کر وطن کے لئے بھی دلفگار رہا جا سکتا ہے، اسلام کے لئے پُرزور آواز بلند کرکے ملک کے لئے بھی صدائے صور پھونکی جا سکتی ہے، مسلمانوں کی ہر مصیبت پر بے تاب ہونے کے ساتھ برادرانِ وطن کے لئے بھی سینہ سپر ہونے میں کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی،

مگر یہ ممکن العمل اس وقت ہے جب فکر و نظر کی مبارزطلبی میں بلندی اور عالی ظرفی ہو، حق و صداقت کے اعلان میں سیاسی ریاکاری کے بجائے مخلصانہ بے باکی اور فراخدلی ہو، دعوت و تبلیغ میں پختگی اور اولوالعزمی بھی ہو، یہ ساری باتیں مولانا محمد علی میں تھیں جن کی قدر اہلِ دل، اہلِ توفیق اور اہلِ بصیرت ہی کرتے رہیں گے،

اب جب کہ ہندوستانی مسلمان ایک موثر قیادت سے محروم ہو رہے ہیں تو مولانا محمد علی یاد آتے ہیں اور اکثر یاد آتے ہیں، اُن کی قیادت میں مسلمانوں نے گھر بار چھوڑ کر مال و دولت لٹا کر عیش و راحت سے منھ موڑ کر، دوش پر کفن اور ہتھیلی پر سر رکھ کر سیاست میں داخل ہونا سیکھا تھا، اور اپنی سیاسی زندگی میں بڑی حرارت اور حرکت پیدا کر لی تھی، مسلمان وہی ہیں، مگر اب وہ راکھ کے ڈھیر ہیں، صرف اس لئے کہ ان میں کوئی محمد علی نہیں، وہ زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ اُن کو ایک اور محمد علی کی ضرورت ہے، جو اُن کو اُن کی سیاسی زندگی میں للّٰہیت اور وطنیت کا درس دے کر اُن میں جرأت، ہمت، دیانت، اخلاص اور یقینِ محکم پیدا کرے،

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے ۔ کہ خم کے خم بھرے ہیں اور میخانہ خالی ہے

پاکستان کے مشہور اہلِ علم اور صاحبِ قلم جناب بشیر احمد ڈار کی وفات کی خبر دیر میں ملی اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو غریقِ رحمت فرمائیں وہ اقبالیات کے بڑے اداشناس اور ماہر تھے اپنے علمی کمالات کے ساتھ اپنی شرافتِ اخلاق، انکسار اور وضعداری کی وجہ سے اپنے دوستوں اور ملنے والوں میں بہت مقبول تھے، آیندہ اشاعت میں ان پر ایک تعزیتی مقالہ شائع ہوگا،

کاغذ کی گرانی کی وجہ سے دارالمصنفین کی مطبوعات کی قیمتوں میں آیندہ کچھ اضافہ ہو جائے گا،

مقالات

قاضی زادہ رومی مصنف شرح چغمینی

احوال و آثار

از جناب شبیر احمد خاں غوری، ایم اے، ایل ایل بی، ریسرچ فیلو انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ علی گڑھ

(۲)

ماوراء النہر کا علمی ماحول چنگیز کی طرح تیمور نے بھی مشرق وسطیٰ کو روند ڈالا تھا مگر اس کے برخلاف وہ جس علاقہ کو فتح کرتا تھا وہاں سے زر و جواہر کے ساتھ اربابِ کمال کو بھی اپنے ہمراہ لا کر دار السلطنت کی زیب و زینت بناتا تھا، صاحب حبیب السیر نے لکھا ہے:-

"و از ہر مملکت کہ تحت تصرفش در آمد، علماء و فضلاء و دانشمندان و ہنرمندان را کوچانیدہ قرین اعزاز و اکرام بماوراء النہر رسانید[1]"

چنانچہ جب اس نے ۷۸۱ھ میں خوارزم پر حملہ کیا تو ملک محمد سرخسی نے اس سے درخواست کی کہ فتح کے بعد مولانا سعد الدین تفتازانی کو وہاں سے سرخس بھیج دیا جائے تیمور نے فتح کے بعد ایسا ہی کیا، مگر ماوراء النہر کے علماء و مشائخ نے جو علامہ سعد الدین تفتازانی کے علم و فضل سے متاثر تھے، بادشاہ سے شکایت کی:-

"اگرچہ تسخیر خوارزم بہ بندگان آستان سلطنت آشیان را تیسیر پذیرفت، ما حاصل

[1] حبیب السیر جلد سوم جزو سوم ص ۸۸

آں مملکت ملک محمد سرخسی گرفت[1]

اور جب تیمور کو معلوم ہوا کہ "حاصل آں مملکت" سے ان کی مراد علامہ سعد الدین تفتازانی سے ہے تو اس نے باصرار والحاح تمام علامہ کو سرخس بلا بھیجا اور انتہائی عزت و احترام کے ساتھ اپنے دربار میں رکھا، صاحبِ "حبیب السیر" لکھتے ہیں:-

"امیر تیمور در تعظیم آں پادشاہ علماء و خسرو دانشمندان مبالغہ بسیاری نمود و در مجالس آنجناب را از بر توشک خویش جای داد و در وقت مراجعت تا سر طناب خیمہ خانہ مشایعت می فرمود"[2]

اسی طرح جب ۷۸۹ھ میں شیراز پر حملہ کیا اور فتح کے بعد مغل غارتگروں کی رسم معہود کے مطابق شہر میں لوٹ مار مچائی تو وزیر نے میر سید شریف جرجانی کے دولت کدہ کو دار الامن قرار دیدیا، سپاہیوں کو حکم تھا کہ جو ان کے مکان میں پناہ۔ اس کے جان و مال سے تعرض نہ کیا جائے، امن قائم ہونے کے بعد اس عزت و احترام کے بدلے میں انھیں سمرقند آنا پڑا[3] جہاں وہ تیمور کی وفات تک انتہائی اعزاز و اکرام کے ساتھ (علامہ تفتازانی سے بھی زیادہ، اگرچہ اپنی طبیعت کے خلاف) مقیم رہے،

اسی طرح جب ۸۰۳ھ میں دمشق پر حملہ کیا اور لشکر نے فتح کے بعد قتل و تغلب کا سلسلہ شروع کیا تو بقیۃ السیف میں قرأت کے مشہور عالم مولانا شمس الدین محمد جزری، سید محمد بخاری اور مولی شمس الدین فناری بھی مفرورین کے ساتھ بھاگ

۱ حبیب السیر ص ۸۰ ۲ ایضاً ص ۸۰ ۳ الشقائق النعمانیہ ص ۸۴

نکلے مگر لشکر نے پکڑ لیا اور گرفتار کر کے تیمور کے پاس لائے[1] جب اسے شیخ محمد جزری کے علم و فضل کا حال معلوم ہوا تو انھیں دار السلطنت لے آیا جہاں وہ اس کی وفات تک بڑے عزت و احترام سے رہے،

اس سے پہلے جب ۸۰۱ھ میں ہندوستان پر حملہ کیا تھا اور فتح کے بعد بہت سے قیدی دربار میں لائے گئے تو ان میں مولانا احمد تھانیسری بھی تھے ان کی علمی گفتگو سے تیمور اتنا متاثر ہوا کہ انھیں سمرقند چلنے پر مجبور کیا مگر وہ راتوں رات دہلی سے نکل بھاگے[2]

اس طرح ممالک مفتوحہ کے نفائس و رغائب ہی سے تیمور نے سمرقند کی ثروت میں اضافہ نہیں کیا، مختلف ممالک کے باشندوں کو دار السلطنت میں جمع کر کے اسے عروس البلاد بنا دیا، ان میں سے بعض مشاہیر حسب ذیل ہیں،

علامہ سعد الدین تفتازانی، میر سید شریف جرجانی، شیخ شمس الدین محمد جزری، مولانا شمس الدین محمد شافعی، سید برہان الدین اشرف بن مبارک شاہ، شیخ بہاء الدین محی بن عبید اللہ، شیخ بدر الدین حنفی، شیخ سراج الدین، مولانا حمید الدین شاشی، مولانا نظام الدین شامی، قاضی قطب الدین بن عبد اللہ امامی، مولانا صفی الدین ختلانی، مولانا نجم الدین طارمی، خواجہ علی تبریزی، مولانا حسام الدین بن ابراہیم شاہ، مولانا عبید اللہ بن لسان الدین محمد[3]

تیمور نے ۸۰۷ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا، پہلے کچھ دن اس کا پوتا خلیل سلطان اور پھر بیٹا شاہ رخ اس کے جانشین ہوئے، شاہ رخ کا طویل عہد حکومت سنۓ

۱ حبیب السیر ص ۵۰۹ ۲ اخبار الاخیار ص ۱۵۱ نیز سبحۃ المرجان ص ۴۸ ۳ حبیب السیر ص ۵۸۰-۹۲

ممالک کی فتح کے بجائے ملک موروثی پر قبضہ مستحکم بنانے میں گذرا، بایں ہمہ اس نے بھی علمی سرپرستی کی روایات کو زندہ رکھا، اس کے عہد کے علماء و فضلاء میں حسب ذیل باکمال مشہور رہے:

مولانا شمس الدین محمد تفتازانی، مولانا جلال الدین یوسف اوبہی، مولانا نورالدین لطف اللہ المشہور بحافظ ابرو، خواجہ نورالدین عبدالرحمٰن جامی، مولانا رکن الدین خوافی، مولانا کمال الدین خوارزمی، سید صدرالدین یونس، مولانا جلال الدین، خواجہ صاین الدین علی اصفہانی، مولانا جمال الدین عبدالغفار سمرقندی، امیر ... پسر میر سید شریف، عبدالقادر مراغی، مولانا شمس الدین علی، مولانا زادہ ابہری وغیرہم[1] ان میں چار باکمال اس کے دربار کے چار رتن تھے، جن کے بارے میں دولت شاہ لکھتا ہے،

"گویند چہار ہنرمند در پائے تخت شاہرخی بودند کہ بروزگار خود نظیر نداشتہ اند، خواجہ عبدالقادر مراغی در علم ادوار و موسیقی، و یوسف اندکانی در خوانندگی و خطی، و استاد قوام الدین در ہندسی و طراحی و معماری، و مولانا خلیل اللہ مصور کہ ثانی مانی بود"[2]

شاہرخ نے ۸۵۰ھ میں انتقال کیا، اور اس کا جانشین اس کا بیٹا الغ بیگ ہوا، وہ خود صاحب علم و فضل تھا، اور اہل فضل و کمال کا قدردان، اس کے علم و فضل کے بارے میں عبدالرزاق کاشی نے "مطلع السعدین" میں لکھا ہے:

"میرزا الغ بیگ کہ در علوم و فنون صاحب نصیب اوفی و نصاب مستوفی بود"[3]

اسی طرح صاحب "حبیب السیر" اس کے علم و فضل کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"دانش جالینوس با حشمت کیکاوس جمع نمودہ و در سایر فنون خصوصاً علم ریاضی

[1] حبیب السیر ص ۴۲ ۱۵ [2] تذکرۃ الشعراء دولت شاہ سمرقندی ص ۳۲۱ [3] مطلع السعدین ص ۲۱۸

و نجوم در آن زمان عدیل و نظیر نداشت"[1]

دولت شاہ نے اس کے بارے میں لکھا ہے:-

"اما شاہ مغفور سعید الغ بیگ گورگانی سقی اللہ روضتہ و انار اللہ برہانہ پادشاہ عالم عادل قاہر صاحب ہمت بود و در علم نجوم مرتبہ عالی یافت و در معانی موئے می شگافت"[2]

الغ بیگ خود صاحب فضل و کمال ہونے کے ساتھ علم دوست و علماء نواز بھی تھا، صاحب "حبیب السیر" نے لکھا ہے:-

"پیوستہ ہمت بر تربیت اہل فضل و کمال می گماشت"[3]

دولت شاہ اسکی علم دوستی اور فضل نوازی کے بارے میں لکھتا ہے:-

"درجۂ عالمان بعہد او بذروۂ اعلیٰ بودہ و فضلا را بدوران او مرتبۂ عظمیٰ بی"

صاحب "حبیب السیر" نے اس کے زمانہ میں علماء کا ذکر کرنے سے پہلے اس کی علماء نوازی کے بارے میں لکھا ہے،

"چون بادشاہ عالی جاہ میرزا الغ بیگ بوفور علم و فضل از سائر اولاد و احفاد حضرت صاحبقرانی امیر تیمور گورگانی امتیاز تمام داشت، و ہموارہ ہمت عالی نہمت بر تربیت و رعایت علماء و فضلاء می گماشت، و در زمان دولتش جمع کثیر از آن طائفہ در بلدہ سمرقند مجتمع گشتہ بودند، و در ظلال دولت و اقبالش در غایت فراغت و رفاہیت می غنودند"[5]

[1] حبیب السیر ص ۱۸۱ [2] تذکرہ دولت شاہ ص ۳۵۴ [3] حبیب السیر ص ۱۶۹ [4] تذکرہ دولت شاہ ص ۳۶۴ [5] حبیب السیر ص ۱۵۹

اس کے بعد مندرجۂ ذیل علماء کا تذکرہ دیا ہے:۔

مولانا غیاث الدین جمشید کاشی، مولانا علاء شاشی، مولانا نفیس، مولانا محمد عالم، خواجہ عصام الدین، خواجہ افضل الدین کشی، سید عاشق، مولانا محمد اردستانی، قاضی محمد مسکین، خواجہ فضل اللہ ابو اللیثی، مولانا علاء الدین علی قوشچی، خواجہ عبد المومن، مولانا بدخشی[1]

اس عہد کے ماوراء النہر میں مختلف علوم کی گرم بازاری تھی، مگر قاضی زادہ بالطبع ریاضی وہیئت کے دلدادہ تھے، اور روم کے مقابلے میں ماوراء النہر میں ان علوم کا اچھا خاصہ چرچا تھا، بالخصوص الغ بیگ کے زمانہ میں،

تیموری خاندان نے اپنے پیشرو ایلخیوں سے جہاں سفاکی و خونریزی ورثہ میں پائی تھی، نجوم وہیئت کی سرپرستی میں بھی ان کے نقش قدم پر چلے، تیمور تلوار کا دھنی تھا، مگر درباری منجم عبد اللہ لسان الدین محمد سفر و حضر میں اس کا رفیق و ملازم بارگاہ رہتا تھا، چنانچہ صاحب "حبیب السیر" اس کے ترجمہ میں لکھتے ہیں،

"افضل حکماء زمان و اعلم منجمان دوراں بود۔ احکام نجومی او مانند قضا و قدر تخلف نمی نمود۔ بیت

همه زیچ فلک جدول بجدول   باسطرلاب حکمت کردہ بد حل

و صاحبقرانی خورشید محل نسبت بآں فاضل بے بدل التفات بسیار داشت و آنجناب نیز ہموارہ بسان بخت و دولت در ملازمت بود و رقم اخلاص بر صحیفۂ ضمیری نگاشت"[2]

۱؎ حبیب السیر: جلد سوم جزو سوم ص ۵۹ و ما بعد ۲؎ ایضاً: جلد سوم جزو سوم،

تیمور جن افاضل روزگار کو ممالک مفتوحہ سے لایا تھا، ان میں لگ سرسبد میر سید شریف جرجانی تھے، وہ جملہ علوم میں پایۂ سامی رکھتے تھے، ریاضی وہیئت میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا، انھوں نے ہندسہ میں "تحریر اقلیدس طوسی" اور "اشکال التاسیس" سمرقندی کی اور ہیئت میں "تذکرہ محقق طوسی" اور چغمینی کے "الملخص فی الہیئت" کی شروح لکھی تھیں[1] ریاضی وہیئت میں ان کے فضل و کمال کا شہرہ ہمارے رئیس التذکرہ کو بھی کشاں کشاں ان کی مجلس درس میں لے گیا،

شاہ رخ کے زمانہ میں بھی ان علوم کے ماہرین رہے ہوں گے، مگر ان میں لگ سرسبد قوام الدین شیرازی تھے، جو بقول دولت شاہ دربار شاہ رخ کے چار رتنوں میں سے ایک تھے، سول انجینیرنگ میں ان کے کمال کے متعلق صاحب "حبیب السیر" نے لکھا ہے:۔

"استاد قوام الدین معمار شیرازی قدوۂ مہندسان زمان و مرجع معماران دوران بود۔ از جملہ آثار آں استاد نادرۂ کار در دار السلطنت ہراۃ عمارات عالیات مہد علیا گوہر شاد آغاست"[2]

نجوم میں ان کے تبحر علمی کے سلسلے میں یہ حکایت مشہور تھی کہ ایک مرتبہ شاہ رخ کسی عمارت کے سلسلے میں ان سے ناراض ہو گیا اور سال بھر تک انھیں دربار کی حاضری سے محروم رکھا، آخر میں جب انھیں باریابی کی اجازت ملی اور دربار میں حاضر ہوئے تو تقویم نکال کر پیش کی کہ میں نے از روئے نجوم معلوم کر لیا تھا کہ آج میرا قصور معاف کیا جائے گا اور مجھے شرف بساط بوسی سے نوازا جائے گا، شاہ رخ نے زیر لب تبسم کیا اور کہا

۱؎ سخاوی: الضوء اللامع الجزء الخامس ص ۳۲۸ ۲؎ حبیب السیر ص ۱۳۸-۱۳۷

تو کار زمیں را نکو ساختی کہ با آسماں نیز پرداختی[1]

اس عہد کے ایک اور ماہر ہندسہ و ریاضی مولانا جلال الدین برادر اعیانی مولانا شہاب الدین تھے، مختلف علوم و فنون میں ید طولیٰ رکھتے تھے، مگر لشکریوں کی وضع میں رہتے تھے اس سے مرزا الغ بیگ کو غلط فہمی ہوئی اور ایک دن محض انھیں آزار پہنچانے کے لیے ریاضی و ہیئت کے کچھ مسائل لکھ کر انھیں دیے کہ یہ تمہارے خاندانی علم کے مسئلے ہیں، مجھے ان کا حل درکار ہے، مولانا جلال الدین نے انھیں بڑی خوش اسلوبی سے حل کر دیا، مرزا الغ بیگ کی غلط فہمی رفع ہو گئی اور اسے ان کی جودت طبع کا اندازہ ہو گیا تھا[2]

اور الغ بیگ کا عہد تو تیموری خاندان میں ریاضی و ہیئت کی ترقی کا نقطۂ عروج ہے، اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

مجمع علمی سمرقند کا قیام | یورپ میں سائنٹفک سوسائٹیوں کا سلسلہ سترھویں صدی میں شروع ہوا ہے[3] مگر ماوراء النہر میں اس کی ابتدا اس سے کہیں پہلے ہو چکی تھی، اہل علم و فضل کی تربیت اسلامی ثقافت کی ایک غیر متبدل رسم رہی ہے، اور یوں تو ہر مغل تاجدار کا دربار مجمع اہل کمال ہوا کرتا تھا، مگر الغ بیگ کو اپنے خاندان میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے ریاضی و ہیئت کے علما سے تحریر پر مشتمل ایک علمی انجمن قائم کی، جس کے بارے میں صاحب "مطلع السعدین" لکھتے ہیں:

---

۱ حبیب السیر ص ۱۳۰ ۲ ایضاً ص ۱۲۹، ۱۳۰ ۳ یورپ میں اس قسم کی قدیم ترین انجمن فلورنس کی Academy of experiments تھی جو ۱۶۵۷ء میں قائم کی گئی تھی، اس کے پانچ سال بعد رائل سوسائٹی لندن کا سنگ بنیاد رکھا گیا ۱۶۶۲ء، چار سال بعد پیرس کی Academie des Science قائم ہوئی ۱۶۶۶ء، برلن اکیڈمی ۱۷۰۰ء میں اور سنٹ پیٹرس برگ اکیڈمی ۱۷۲۴ء میں قائم کی گئی۔

"(مرزا الغ بیگ) خواست کہ انوار دانش خویش چوں اشراق آفتاب در اقطار آفاق ظاہر گرداند و فروغ ادراک از مغفر خاک بمحدب فلک الافلاک رساند و صدائے رصد کواکب در گنبد گردوں اندازد و طنطنۂ ایں کار بزرگ در اطراف ربع مسکون منتشر سازد۔ بنا براں با خواص حکما و فحول عقلاء مہندسان عطارد ذکا و فیلسوفان مجسطی کشا کہ در جمیع علوم و حقائق معلوم و مفہوم بتخصیص ریاضی و حکمی عجوبۂ عصر و نادرۂ دہر بود ند مثل فلاطون زمان مولانا صلاح الدین موسیٰ قاضی زادہ رومی بطلیموس دوراں مولانا علاء الدین علی قوشجی کہ تربیت یافتہ میرزا الغ بیگ بود و بزبان عنایت او را فرزند خطاب فرمودہ و ایں دو محقق دانشمند در سمرقند اقامت داشتند و مولانائے اعظم غیاث الدین جمشید و مولانائے معظم معین الدین کہ مرزا الغ بیگ ایشاں را از کاشان بسمرقند برد انجمنے ساختہ و در معرفت دقائق تنجیم و ادراک غوامض تقادیم آں دانشوران کہ بمدد عقل کل بر کیفیت ہر جزوے از اجزائے سپہر واقف بودند و بخطوات اقدام مسافر وہم کمیت طول و عرض عالم علوی پیمودہ و در تحقیق ابعاد و سطوح اجرام ہیچ دقیقہ مہمل و ہیچ ثانیہ نامرعی نماند و در ارتفاع درجات مرتبۂ سخن بفلک الافلاک رسانیدہ سخنان پرداخت"[1]

یہ مجلس غالباً ۸۲۳ھ سے پہلے قائم ہوئی تھی جب کہ الغ بیگ اپنے باپ کے ظل تربیت ہی میں پرورش پا رہا تھا، اس "مجمع علمی" کے ارکان اربعہ میں سے مولانا غیاث الدین جمشید کاشی کے بارے میں صاحب "حبیب السیر" لکھتے ہیں:

---

۱ مطلع السعدین ص [illegible]

"مولانا غیاث الدین جمشید . . . . در علم ہئیت و ریاضی و فن نجوم عدیل و نظیر نداشت"[1]

انھوں نے اس دوران میں "زیج خاقانی" کے نام سے ایک نئی زیج مرتب کی (جسے ایتھے نے انڈیا آفس لائبریری کی فہرست کتب میں "زیج الغ بیگ کا ابتدائی ایڈیشن لکھا ہے"[2] مگر) جو محقق طوسی کی مرتب کردہ "زیج ایلخانی" کا تتمہ تھی جیسا کہ وہ خود اپنے رسالہ "مفتاح الحساب" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

"استأنفت استخراج جمیع جداول الزیج الایلخانی بادق عمل وصنعت الزیج المسمی بالخاقانی فی تکمیل الزیج الخاقانی وجمعت فیہ جمیع ما استنبطت من اعمال المنجمین مما لا یاتی من زیج آخر مع البراہین الھندسیۃ"[3]	میں نے زیج ایلخانی کی جملہ جدولوں کا بڑے دقیق عمل کے ذریعہ از سر نو استخراج کیا اور ایک نئی زیج مرتب کی جس کا نام "زیج خاقانی" کی تکمیل "زیج ایلخانی" ہے۔ میں نے اس کے اندر وہ تمام باتیں جمع کر دیں جنھیں میں نے پچھلے ہئیت دانوں کے اعمال سے مستنبط کیا اور جو کسی اور زیج سے معلوم نہیں ہو سکتیں اور ان سب کے ہندسی دلائل بھی بیان کیے ہیں،

۲۔ اس "زیج خاقانی" کے علاوہ انھوں نے ایک اور زیج بھی لکھی جس کا نام "زیج التسہیلات" رکھا،

۳۔ ان دو زیجوں کے علاوہ متعدد جداول تیار کیں،

۴۔ اجرام سماویہ کے ابعاد و اجرام کے بارے میں متقدمین کو بہت سے اشکال تھے

---

[1] حبیب السیر ص ۱۵۹ [2] Catalogue of India office - Library col. 1220 [3] مفتاح الحساب جمشید کاشی مقدمہ مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ذخیرہ مولانا عبدالحی نمبر ۲۹/۱۹ صفحہ اب

ان کے حل کے لیے انھوں نے ایک رسالہ بنام "سلم السماء" لکھا،

۵۔ دائرہ کے قطر اور محیط کی نسبت (π) کی زیادہ تحقیقی قیمت دریافت کرنے کے لیے ایک رسالہ بنام "رسالہ محیطیہ" لکھا،

۶۔ قدیم علم المثلثات کا ایک مسئلہ لاینحل یہ تھا کہ ایک معلوم الوتر قوس کے تہائی حصہ کی قوس کا وتر کیسے دریافت کیا جائے، جمشید کاشی نے اس مسئلہ کے حل کے لیے ایک رسالہ بنام "رسالۃ الوتر والجیب" لکھا،[1]

۷۔ انھوں نے ایک آلہ ایجاد کیا تھا جس کے ذریعہ کواکب کی تقویم، ان کے عروض، زمین سے ان کے فاصلے، ان کی رجعت و استقامت، کسوف و خسوف اور دیگر متعلقات دریافت ہوتے تھے، اس آلہ کی تیاری اور طریق استعمال کے لیے ایک رسالہ بنام "نزہۃ الحدائق" لکھا تھا،[2]

۸۔ مفتاح الحساب: یہ علم حساب کی ایک مفید کتاب ہے، جو ایک مقدمہ اور پانچ مقالات پر مشتمل ہے، حساب صحاح، حساب کسور، حساب منجمین، مساحت اور جبر و مقابلہ[3]

انڈیا آفس لائبریری کے مرتب فہرست ڈاکٹر ہرمن ایتھے نے "زیج خاقانی" کا سال تکمیل ۸۱۶ھ بتایا ہے، حالانکہ الغ بیگ نے رصدگاہ سمرقند ۸۲۳ھ کے بعد قائم کی تھی، اسی بنا پر میرا خیال ہے کہ الغ بیگ نے یہ مجلس علمی جس کے ایک رکن رکین کا کارنامہ یہ "زیج خاقانی" ہے ۸۱۶ھ سے پیشتر قائم کی تھی، یہ بھی واضح رہے کہ "زیج خاقانی"

---

[1] مفتاح الحساب: مقدمہ ص ۲ ظ [2] کشف الظنون جلد ثانی ص ۹۷ و ۳۹۵ نیز مفتاح الحساب ص ۲ ظ [3] مفتاح الحساب مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ذخیرہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی نمبر ۲۹/۶۹ عربی۔

الغ بیگ کی مرتب کردہ "زیج جدید گورگانی" سے بالکل مختلف ہے کیونکہ ابتھے کی دی ہوئی تفصیل کے مطابق زیج خاقانی میں چھ مقالے ہیں، جب کہ زیج گورگانی (یا زیج الغ بیگ) چار مقالوں پر مشتمل ہے اور اس لیے اول الذکر کو ثانی الذکر کا "پہلا (یا ابتدائی) ایڈیشن" نہیں کہا جاسکتا،

بعد میں جب الغ بیگ نے ۸۲۳ھ میں سمرقند میں رصد گاہ تعمیر کرائی تو اس رصد گاہ کا سب سے پہلا سربراہ غیاث الدین جمشید کاشی ہی کو مقرر کیا اور وہ مولانا معین الدین کاشی اور ہمارے رئیس التذکرہ کی اعانت سے اس فریضہ کی انجام دہی میں مصروف ہوگئے۔ مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

دوسرے کارکن مولانا معین الدین کاشی کے حالات کی تفصیل تاریخ نے محفوظ نہیں رکھی، صاحب مطلع السعدین نے صرف اتنا لکھا ہے کہ الغ بیگ نے انھیں کاشان سے بلا کر اس "مجمع علمی" کا رکن بنایا تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فنونِ ریاضیات کے اندر اپنے عہد کے نوابغِ روزگار میں محسوب ہوتے تھے،

اس علمی مجلس کے تیسرے رکن رکین ہمارے رئیس التذکرہ تھے، جن کی علمی سرگرمیوں کی تفصیل آگے آرہی ہے،

چوتھے رکن مولانا علاء الدین علی قوشجی تھے، جن کے متعلق یہ طے کرنا مشکل ہے کہ وہ ریاضیات کے ماہر خصوصی تھے، یا علم کلام کے "محقق" طوسی کی "تجرید الکلام" کی انھوں نے جو شرح لکھی ہے (اور جو سابق کی شروح سے امتیاز کے لیے "شرح جدید تجرید" کہلاتی ہے) اس نے پچھلے شارحین کی شروح کو گوشۂ گمنامی میں ڈال دیا اور جلد ہی معقولات کے اعلیٰ نصاب میں ایک ممتاز مقام حاصل کرلیا اور یہ شرف اسے آج تک حاصل ہے،

بایں ہمہ وہ صف اول کے ہیئت دان بھی تھے کیونکہ قاضی زادہ کی وفات کے بعد وہی رصد گاہ سمرقند کے متولی مقرر ہوئے اور بادشاہ نے انھیں کی مدد سے نئے فلکی مشاہدات اور ہیئتی دریافتوں کو "زیج جدید گورگانی" میں مرتب کرایا، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے، صاحب "مطلع السعدین" نے انھیں "بطلیموس دوران" بنایا ہے، اور صاحب "حبیب السیر" نے "اعلم علمائے زماں وافضل حکمائے دوران" لکھا ہے، خود بادشاہ الغ بیگ "زیج جدید گورگانی" کے دیباچہ میں ان کے بارے میں لکھتا ہے:-

فرزند ارجمند علی بن محمد قوشجی کہ در حداثت سن وعنفوان شباب قصب السبق در مضمار فنون وعلوم نبوعے ربودہ کہ امید وثوق ورجا متحقق است کہ صیت ماثر آں علی اقرب الزمان باسرع آوان باطراف واکناف منتشر ومستفیض گردد۔[1]

رصد گاہ کی آخری تولیت اور "زیج جدید" کی تکمیل وترتیب میں بادشاہ کی اعانت کے علاوہ انھوں نے حسب تصریح حاجی خلیفہ اس "زیج الغ بیگ" کی شرح بھی لکھی تھی، جو مختلف ضابطوں کی ہندسی دلیلوں پر مشتمل ہے[2] علامہ قوشجی کی عبقریت کا شاہکار تو ان کی "شرح تجرید جدید" ہے جو معقولات کی ادبیات عالیہ میں محسوب ہوتی ہے، اگر ریاضی وہیئت میں ان کے دو رسالے مشہور ہیں، ایک حساب میں بنام "رسالہ محمدیہ" اور دوسرا ہیئت میں بنام "رسالہ فتحیہ" (جو عرصہ تک "رسالہ قوشجی" کے نام سے ہیئت کے ابتدائی نصاب میں شمول رہا ہے) دونوں رسالے انھوں نے سلطان روم محمد فاتح کے نام معنون کیے تھے[3]

[1] زیج الغ بیگ: مقدمہ: (مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یونیورسٹی کلیکشن نمبر ۲۰ فارسیہ علوم) ص ۲ ظ [2] کشف الظنون جلد ثانی ص ۱۴ [3] الشقائق ص ۱۷۸، ۱۸۹،

قوشچی جیسا عبقری روزگار بھی ہمارے رئیس التذکرہ کا شاگرد تھا، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

قاضی زادہ ماوراء النہر میں ماوراء النہر کا یہ علمی ماحول تھا، جس کے اندر قاضی زادہ ایران سے تشریف لائے، طاشکبری زادہ لکھتے ہیں:-

"پھر انھوں نے ماوراء النہر کا سفر کیا اور وہاں کے علماء سے پڑھا، وہاں انھوں نے بہت سے علوم حاصل کیے، اور ان کے اندر فضل و کمال کے بلند ترین مرتبہ تک پہنچ گئے، ان کے فضائل مشہور ہو گئے، ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی، اور زبان خلق پر انھیں کا ذکر جاری ہو گیا، یہاں وہ قاضی زادہ کے نام سے ملقب ہوئے"[1]

بدقسمتی سے تاریخ نے یہ تفصیل نہیں لکھی کہ وہ ماوراء النہر کب تشریف لائے، لیکن چونکہ انھوں نے ۸۱۵ھ میں "شرح چغمینی" جیسی کتاب لکھی، جو آج تک اسلامی علم الہیئت کی ادبیات عالیہ میں شمار کی جاتی ہے، اور جس کی تصنیف کے لیے مصنف کو حصول علم سے فارغ ہونے کے بعد بیس پچیس سال کی پختگی فضل و کمال درکار رہی ہے، اس لیے اگر یہ فرض کیا جائے کہ وہ ایران سے ماوراء النہر آٹھویں صدی کے آخری عشرہ میں پہونچے تو غالباً یہ حقیقت سے زیادہ بعید نہ ہوگا۔

اسی وقت تیمور کا دربار مجمع اہل کمال بنا ہوا تھا، جس کے گل سر سید میر سید شریف جرجانی تھے، وہ مختلف علوم میں تبحر کے ساتھ ریاضی و ہیئت میں بھی دستگاہ عالی رکھتے تھے، انھوں نے ہندسہ میں محقق طوسی کی "تحریر اقلیدس" اور شمس الدین سمرقندی کی "اشکال التاسیس" کی اور ہیئت میں عمر بن محمود الچغمینی کی "الملخص فی الهیئة" اور محقق طوسی کی

"التذکرہ فی الهیئة" کی شرح لکھی تھیں۔

قاضی زادہ نے بھی جو علوم ریاضیہ میں کسب کمال کے خواہاں تھے، ان علوم میں میر سید شریف کے فضل و کمال کی شہرت سنی اور استفادے کے لیے ان کے پاس پہونچے، میر سید شریف کو خصوصی تبحر علم کلام میں تھا، مگر قاضی زادہ کو اس سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، وہ تو علوم ریاضیہ کے شائق تھے، اور ان علوم کے اندر سید شریف ان کو مطمئن نہ کر سکے، اور وہ جلد ہی مایوس ہو کر لوٹ آئے، چنانچہ طاشکبری زادہ نے لکھا ہے:-

"روایت کی جاتی ہے کہ انھوں نے میر سید شریف سے بھی پڑھا تھا، مگر دونوں کے درمیان موافقت قائم نہ رہ سکی، اس لیے قاضی زادہ نے ان سے پڑھنا چھوڑ دیا، میر سید شریف کا قاضی زادہ کے بارے میں کہنا تھا کہ ان کی طبیعت پر ریاضیات کا غلبہ ہے اور قاضی زادہ میر سید شریف کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ (مجھے) علوم ریاضیہ میں مطمئن نہیں کر سکتے"[1]

اسی چشمک کے زیر اثر قاضی زادہ نے میر سید شریف کی "شرح الملخص فی الهیئة" پر اپنی "شرح چغمینی" میں ان کا نام لیے بغیر جا بجا تعریض کے پیرایہ میں اعتراض کیے ہیں[2] اسی جذبہ کے تحت انھوں نے ہر چند کہ انھیں علم کلام سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، میر سید شریف کی "شرح المواقف" کا بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا اور اکثر مقامات پر شارح (میر سید شریف) پر نقض وارد کیے، مگر ان نقائض کو قید کتابت میں نہیں لائے، صرف حاشیہ پر قلم سے حلقے بنا کر ان "محلات نظریہ" کی طرف اشارے کر دیے، طاشکبری زادہ نے

لکھا ہے کہ بلادِ عجم میں ان محلات نظریہ کے ذریعہ طلبہ کی ذہانت کا امتحان لیا جاتا ہے
کہ معترض یہاں کیا اعتراض کرنا چاہتا تھا[1]۔

غالباً ماوراء النہر میں قاضی زادہ نے اور علماء کے یہاں رہ کر بھی پڑھا تھا جیسا کہ
طاشکبری زادہ نے لکھا ہے، اور انھیں علمائے ماوراء النہر کے فیض تلمذ نے قاضی زادہ
کو قاضی زادہ بنایا، مگر ہمیں ان اساتذۂ کرام کے نام معلوم نہیں ہیں، بہرحال کچھ
تو ہونہار شاگرد کی غیر معمولی صلاحیت اور کچھ شفیق اساتذہ کا فیض جلد ہی ان کے
علم و فضل کا تذکرہ ماوراء النہر کے علمی حلقوں کی رونق بن گیا۔

قاضی زادہ الغ بیگ کے دربار میں

یہ تذکرہ الغ بیگ کے کانوں تک پہونچا، وہ تو
اہل کمال کا جویا اور قدر دان تھا ہی، بلا کر انھیں اپنے تقرب خصوصی سے نوازا
طاشکبری زادہ لکھتے ہیں:-

"قاضی زادہ والی سمرقند کی خدمت میں باریاب ہوئے، وہ امیر کبیر الغ بیگ
تھا ...... اس نے ان کی طرف خصوصی توجہ کی اور تقرب خصوصی سے نوازا"[2]

الغ بیگ خود علوم ریاضیہ میں عبقری وقت تھا، اس نے قاضی زادہ کی آمد
کو مغتنمات روزگار میں شمار کیا، اور ریاضیات کی اعلیٰ کتابیں ان سے پڑھیں جیسا کہ
طاشکبری زادہ لکھتے ہیں:

امیر مذکور (الغ بیگ) علوم ریاضیہ کا شائق تھا لہٰذا اس نے ان سے
(قاضی زادہ سے) علوم ریاضیہ کی بہت سی کتابیں پڑھیں[3]

وہ صرف ان کے علم و فضل کا معترف ہی نہ تھا بلکہ ان کے تلمذ پر فخر بھی کرتا

۱؎ الشقائق صفحہ ۱۰، ۲؎ ایضاً ص ۱۱، ۳؎ ایضاً ص ۱۱

تھا چنانچہ "زیج جدید گورگانی" کے دیباچے میں انھیں بڑے عزت و احترام کے ساتھ
یاد کرتا ہے:-

"حضرت استاذی و سندی علامۃ العالم، ناصب امارات الفضل
والحکم، سالک مسالک التحقیق، ناهج مناهج التدقیق مولانا
صلاح الملۃ والدین موسیٰ المشتهر بقاضی زادہ الرومی علیہ الرحمۃ
والغفران"[1]

قاضی زادہ بھی سعادت مند شاگرد کے عزت و احترام سے اتنے متاثر ہوئے کہ وطن
عزیز اور اعزہ و اقارب سبھی کو بھول گئے، چنانچہ "شرح جغمینی" کے دیباچہ میں ترک وطن کا
سبب دربار سمرقند کی غیر معمولی مہمانداری کو قرار دیتے ہیں، جس نے ان کے دل سے
نہ صرف وطن بلکہ عزیزوں اور دوستوں تک کو فراموش کرادیا۔

ولا عیب فیهم غیر ان ضیوفهم　　تلام بنسیان الاحبۃ والوطن[2]

یہی نہیں بلکہ اس زمانہ (۱۴۱۲-۱۵ھ) میں انھوں نے جو دو کتابیں "شرح جغمینی" اور
"شرح اشکال التاسیس" لکھیں، انھیں عزیز شاگرد ہی کے نام معنون کیا، اور ان کے دیباچے
میں اس کی تعریف و توصیف میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا، چنانچہ شرح جغمینی کے دیباچہ
میں کمال خلوص و محبت کے ساتھ اسے دعائے بزرگانہ سے نوازتے ہوئے لکھتے ہیں:-

جب یہ کتاب مکمل ہوچکی اور اس کے لکھنے سے فراغت ہوئی تو میں نے اسے اس
بارگاہ میں بطور تحفہ پیش کیا جو اپنی بہجت و خوبی کی بنا پر دلوں کے لئے موجب
حیرت ہے اور اس آستانۂ عالی میں بطور پیش کش رکھا جو اپنی نزہت و پاکیزگی

۱؎ زیج الغ بیگ: مخطوطہ مذکورہ بالا، صفحہ ۲ ظ، ۲؎ الشقائق ص ۱۰، نیز شرح اشکال التاسیس مخطوطہ مذکورہ
بالا بعد صفحہ ۲ ظ

میں رشک بہشت ہے، وہ اس ہستی کی بارگاہ ہے جس نے بھلائی اور احسان کی نشر و اشاعت کی ہے، امن و امان کو پھیلا دیا ہے، عدل و انصاف کی ترازو قائم کی ہے، جنبہ داری اور ظلم کی آگ کو بجھا دیا ہے، عقل کے باغ کو اپنی خوبی ہیبت سے شاداب بنایا ہے اور اپنی تقویت کی برکت سے شریعت کی کلیوں کو کھلا دیا ہے، اس کی طبیعت کے نقادوں نے تمام علوم کے اصول و فروع کو رواج دیا ہے، اور معارف منقول ہوں یا معقول سب کو اتقان بخشا ہے، سو (ممدوح) چاشت کے وقت کا سورج ہے، اندھیری رات کا بدر ہے، بلندی مرتبہ کا آسمان ہے، مخلوق میں سب سے بہتر ہے، بخشش کا سمندر ہے اور ہدایت کا جھنڈا ہے، (ارے میں نے یہ کیا کہہ دیا) بھلا سورج کو برستے بادل جیسا (ممدوح کا) ہاتھ کہاں نصیب ہے، اور چاند کو جوش مارتے سمندر جیسی (ممدوح کی) ہتھیلی کہاں حاصل ہے، سرداری کا نور اس کی پیشانی میں چمکتا ہے اور نیک بختی کی کلیاں اس کے رخساروں میں چمکتی ہیں، (نہیں) بلکہ وہ مرتبۂ عالی کی آنکھ کا نور اور سلطنت کے چمن کا پھول ہے

جب اس کے اندر اپنے دادا (تیمور) کی دولت و عظمت نظر آئی تو لوگوں نے بچپن ہی میں اس کا نام امیر اعظم (الغ بیگ) رکھ دیا،

وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کا سایہ ہے، حق، ملت اور دین کا فریادرس ہے، سلطان ہے، سلطان کا بیٹا اور سلطان کا پوتا یعنی الغ بیگ بن شاہرخ بن تیمور گورگان اللہ تعالیٰ اس کی سلطنت کے آفتاب کو زوال سے دور اور اس کی دولت و حکومت کے چاند کو کمال پر قائم رکھے، جب تک تارے آسمان پر گردش

کرتے رہیں اور پہلیں زمین پر اگتی رہیں یا اللہ اس کے دوستوں کی مدد فرما! اور اس کے دشمنوں کو ذلیل و خوار کر، اور جب تک لیل و نہار کا سلسلہ قائم ہے اس کی مہربانی کا سایہ جملہ مخلوق پر دراز فرما تا رہ، نبی کریم اور ان کے اہل بیت کرام کے صدقہ میں[1]

اسی طرح جب انھوں نے "شرح اشکال التاسیس" لکھی تو اسے بھی الغ بیگ ہی کے نام سے معنون کیا، چنانچہ اس کے دیباچے میں اس کی پوری تفصیل تحریر کی ہے، انھوں نے "شرح چغمینی" حسب تصریح حاجی خلیفہ ۸۱۴ھ میں لکھی اور شرح اشکال التاسیس ۸۱۵ھ میں، چنانچہ مولانا آزاد لائبریری کے ذخیرہ سرشاہ سلیمان مو خر الذکر کا جو مخطوطہ ہے، اس کے آخری صفحہ کے حاشیہ پر مرقوم ہے:-

ھو لفہ رحمہ اللہ تاریخ تالیفہ

جری عادۃ القوم ان ارخو   وتاریخ تالیفہ خیرہ

اس طرح تاریخ تالیف ۸۲۱ھ نکلتی ہے (الا یہ کہ آخری لفظ "خیرہ" ہو بغیر واو) مگر حاجی خلیفہ کا بیان کردہ ۸۱۵ھ ہو یا شعر سے نکلی ہوئی تاریخ ۸۲۱ھ بہر صورت حل طلب مسئلہ باقی رہ جاتا ہے، وہ یہ کہ الغ بیگ ۸۱۲ھ یا ۸۱۳ھ میں درجۂ امارت پر فائز ہوا،

"وجناب الغ بیگی در ظل تربیت والد بزرگوار خویش بسر می برد تا در ۸۱۳ھ بایالت ولایت ماوراء النہر سرافراز گشت"[2]

اور ۸۵۰ھ میں تخت سلطنت پر متمکن ہوا، لہذا اسے سلطان اعظم، خاقان افخم خلد اللہ شموس سلطنتہ، ظل اللہ تعالیٰ فی الارضین جیسے اوصاف سے متصف کرنا کیا معنی ابھی تو اس کا باپ شاہرخ بقید حیات تھا، (باقی)

[1] شرح چغمینی ص ۲ [2] شرح اشکال التاسیس" دیباچہ (مخطوطہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ذخیرہ سرشاہ سلیمان ۶۸/۵۱۰ ص ۱ ظ - ۲ ب) [3] حبیب السیر ص ۱۵۱

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رح

کے

کچھ غیر مطبوعہ فتاوی اور ایک دستاویز

از

جناب مولوی نور الحسن راشد صاحب کاندھلوی

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح اور ان کے نامور صاحبزادگان کی تالیفات و تحریرات کے متعدد مستند اور قیمتی نسخے مختلف اشخاص کے نجی ذخیروں اور غیر معروف لائبریریوں میں پائے جاتے ہیں، جو نہ عام طور پر اہل قلم کے علم میں ہیں اور نہ ہی ان کا تعارف ہوا ہے، اس طرح کی بعض چیزیں ہمارے ذخیرۂ کتب میں بھی محفوظ ہیں، اس میں سے سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رح کے دو غیر مطبوعہ فتاوی اور شاہ صاحب کی مہر اور تحریر سے مزین ایک دستاویز کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ فتاوی ایک طولانی کاغذ کی دونوں سمتوں میں لکھے ہوئے ہیں، کاغذ کے بالائی حصہ پر دونوں طرف ایک ایک سوال اور اس کے نیچے جواب تحریر فرمایا ہے، سائل کی تحریر پختہ اور رواں ہے، کاغذ مضبوط مگر کہیں کہیں کرم خوردہ ہے۔

پہلا سوال "یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ" بطور وظیفہ پڑھنے کے متعلق ہے، اس کا بطور وظیفہ ورد صدیوں سے عوام میں معروف ہے لیکن فقہی اعتبار سے اس کی حیثیت آج بھی مختلف فیہ ہے، علماء میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی رح اسے قطعاً حرام اور

اس کے ورد کو ناجائز قرار دیتے ہیں، علمائے متاخرین میں شاہ عبدالغنی مجددی رح، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا عبدالحی فرنگی محلی، مفتی عزیز الرحمن نے بھی یہی نقطۂ نظر اپنایا ہے اور احتیاط بھی اسی میں ہے لیکن ماہرین علیات، متعدد علماء اور بعض مشائخ (شیخ کلیم اللہ جہان آبادی، مرزا مظہر جانجاناں، شاہ غلام علی) سے مختلف طریقوں سے اس کی قرأت و اجازت معمول و منقول ہے۔[1]

شاہ عبدالعزیز رح نے اس فتوی میں دونوں نظریات کی جامعیت کے ساتھ ترجمانی فرمائی ہے، اس میں فقہاء کے مسلک کی پوری پوری رعایت بھی ہے، اور عاملین کے لیے چند شرائط کے ساتھ اجازت بھی۔[2]

دوسرا سوال یہ ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر استطاعت سے زیادہ مہر مقرر کرنے کا رواج ہے، اور اس کی ادائیگی کا دستور نہیں، مہر اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اس کی یکمشت ادائیگی کا ارادہ کریں تو دوسرے ضروری اخراجات پورے نہیں ہو سکتے،

---

[1] ان فتاوی کا مجموعہ "فتاوی جواز یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ" کے نام سے چالیس پینتالیس سال پہلے نولکشور پریس سے شائع ہوا تھا، آج کل کمیاب ہے۔ [2] مولانا اشرف علی تھانوی کا بھی یہی مسلک ہے کہ "ایسے امور میں تفصیل ہے، صحیح العقیدہ سلیم الفہم کے لیے جواز کی گنجائش ہو سکتی ہے، تاویل مناسب کر کے، اور سقیم الفہم کے لیے بوجہ مفاسد اعتقادیہ و عملیہ کے اجازت نہیں دی جاتی چونکہ اکثر عوام بد فہم اور کج طبع ہوتے ہیں، ان کو علی الاطلاق منع کیا جاتا ہے، اور منع کرنے کے وقت اس کی علت اور مدار نہی کو اس لیے نہیں بیان کیا جاتا ہے کہ قیاس فاسد کر کے ناجائز امور کو جائز قرار دے لیں گے" (امداد الفتاوی ج ۵ ص ۳۵۱ کراچی)

حالانکہ ان اشخاص کے یہاں تمام اسباب تعیش موجود رہتے ہیں اور یہ لوگ پسند نہیں کرتے کہ انہیں غریب کہا جائے یا نذر و منت کی کوئی چیز انہیں دی جائے، ان پر زکوٰۃ اور حج فرض ہے یا نہیں؟ غالباً یہ اس دور کے متوسط طبقہ کا ذکر ہے، جو آج بھی ان ہی حالات کا شکار اور انہی مشکلات و مسائل کا اسیر ہے اس لیے پونے دو سو سال بعد بھی اس فتویٰ کی اہمیت کم نہیں ہوئی اور آج بھی اس کی اشاعت اسی طرح مفید ہے جیسی اس وقت تھی۔

شاہ عبد العزیزؒ کا معمول برجستہ اور قلم برداشتہ لکھنے کا تھا، حوالے اور عبارتیں بھی حافظہ ہی کی مدد سے نقل فرماتے تھے، اس لیے ان کی منقولہ عبارات اور اصل متون میں کہیں کہیں فرق نظر آتا ہے، اسی طرح ان فتاویٰ میں منقول عبارتوں اور ان کتابوں کے مطبوعہ نسخوں کی عبارتوں میں معمولی فرق ہے، جس کی حواشی میں وضاحت کر دی گئی ہے، لیکن اس معمولی تفاوت سے نفس مسئلہ متاثر نہیں ہوتا۔

سوال نمبر ا

خواندن [1] دورد داشتن "یا شیخ عبد القادر جیلانی شیئاً للہ" غائبانہ از مزار شریف کہ ظاہر در این اعتقاد علم غیب در حق آنجناب لازم می آید۔ شرعاً چہ حکم دارد و اگر بر وقت خواندن این کلام معنی ترکیبی از ان مراد ندارد بلکہ آن را مثل دیگر اسماء متبرکہ عبرانیہ یا سریانیہ کہ ہیچ معنی آن با فہم خوانندہ نمی آید، اگرچہ این معنی مستبعد از ترکیب الفاظ است، دانستہ بخواند سوائے این قدر کہ از اعتقاد کردن علم غیب در حق غیر خدا محفوظ ماند و بحسب قواعد شرعیہ باعتبار عظمت خود در انجاح مطالب ہم چیزے مفید است یا غیر مفید؟ و در باب صدور این قسم کلمات از شاغل [2] غیر خواندہ چہ می فرمایند

---

[1] یہ لفظ واضح نہیں ہو سکا ہے۔

و خواندن نادِ علی چہ حکم دارد، و انکہ ام کس است؟ بینوا توجروا۔

ترجمہ سوال:۔ یا شیخ عبد القادر جیلانی شیئاً للہ کا مزار شریف سے غائبانہ پڑھنا اور ورد کرنا کا، حالانکہ بظاہر اس سے شیخ جیلانی کے لیے علم غیب کا اعتقاد لازم آتا ہے شرعاً کیا حکم ہے؟ اور اگر پڑھنے کے وقت اس کے لفظی معنی مراد نہ لیے جائیں اور اس کو عبرانی اور سریانی کے ان اسماء متبرکہ کی طرح سمجھ کر پڑھے جن کے کوئی معنی اس پڑھنے والے کو معلوم نہیں ہوتے، اگرچہ یہ معنی ترکیب الفاظ سے بہت دور ہیں مگر اس سے صرف یہ مراد ہو کہ غیر خدا کے لیے علم غیب کے اعتقاد سے محفوظ رہے اور کیا قواعد شرعیہ اور اپنی عظمت کے لحاظ سے حل مقاصد کے لیے کوئی مفید چیز ہے یا نہیں؟ اور اگر کوئی جاہل اس قسم کے کلمات کہے تو اس کے متعلق علمائے دین کیا فرماتے ہیں؟ اور دعاء نادِ علی پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ اور یہ کس کی طرف منسوب ہے؟

جواب:۔ خواندن مثل این کلمات یکے از سہ وجہ تواند اول آنکہ منادی را علم محیط اعتقاد کند، و قادر مطلق بانجاح مطالب گمان برد، این وجہ مستلزم کفر است بسبب شرک، دوم آنکہ چنان پندارد کہ موکلان این کلام را بگوش روح آن جناب منادی میرسانند، و منادی متوجہ بدعا و التجا از جناب حضرت (کذا؟) کاربر اری من میفرمایند، چنانچہ از لفظ شیئاً للہ ہمیں معنی مستفاد میشود، و این بظاہر ہیچ خلل ندارد، در حدیث صحیح آمدہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمودہ اند "ان للہ ملکاً اعطاہ اللہ اسماع الخلائق عند قبری یبلغونی السلام من سلم علی من امتی" و نیز در حدیث صحیح آمدہ "تعرض علی اعمال امتی فی قبری فان کان خیراً حمدت اللہ وان رائیت شراً استغفرت لھم" [2]

سیوم آنکہ خیال اعتقاد کند کہ نام این بزرگ بطور ورد میخوانم و ہر چند او نمی شنود و قادر در انجاح مطلب من نیست لیکن حق تعالیٰ می شنود و او محبوب و مرضی خدا است او تعالیٰ بنا بر عنایت خود بحال محبوب او و توسل من بآنجناب مطلب من را حاصل خواہد فرمود، چنانچہ ندا پیغمبر را در تشہد از ہمیں باب ساختہ اند السلام علیک ایہا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ، و این مانند آنست کہ شخصے از طفل لایعقل امیرے یا بادشاہے چیزے طلب نماید ہر چند آن طفل او را نہ فہمد و نہ قدرت بر دادن مطلوب دارد لیکن پدر مشفق او مطلب او را بر آرد بنا بر آنکہ این سوال حقیقتاً از پدر است نہ از طفل، و در حدیث صحیح آمدہ کہ برائے حصول مطالب این قسم دعا کنید: اللھم انی اتوجہ الیک بنبیک محمد و (کذا؟) نبی التوبۃ انت تفعل بی کذا وکذا ثم یقول یا محمد انی اتوجہ بک الی ربک ان تفعل بی کذا وکذا[1] واللہ اعلم،

(حاشیہ ص ۴۲۷) [1] یہ حدیث بعینہ ان الفاظ میں ہمیں نہیں مل سکی لیکن مسند بزار کی حضرت عمار بن یاسرؓ کی روایت لفظاً و معناً اس کے قریب قریب ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ان اللہ وکل بقبری ملکا اعطاہ اللہ اسماع الخلائق فلا یصلی علی احد الی یوم القیامۃ الا ابلغنی باسمہ واسم ابیہ ھذا فلان بن فلان قد صلی علیک" الترغیب والترھیب (بحوالہ مشکوٰۃ) ص ۲۹۹. اس مفہوم کی صحیح روایت حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: ان للہ ملائکۃ سیاحین فی الارض یبلغونی عن امتی السلام" رواہ احمد والنسائی والحاکم وابن حبان والبیھقی والصحیحین دون قولہ سیاحین زرقانی ج ۵ ص ۳۳۵ طبع اولیٰ، و روی البزار بسند جید عن ابن مسعودؓ "حیاتی خیر لکم ومماتی خیر لکم تعرض علی اعمالکم فما کان من حسن حمدت اللہ وما کان من سیئ استغفرت اللہ لکم" زرقانی ص ۳۳۷/۵،

مہر (ھو العزیز الولی الرحیم)

ترجمہ جواب:۔ اس طرح کے کلمات کا ورد کرنے میں تین میں سے ایک صورت ضروری ہوتی ہے، اول یہ کہ جس کو آواز دے رہے ہیں اس کے لیے علم محیط کا اعتقاد رکھیں اور اسے تمام ضرورتوں کا پورا کرنے والا خیال کریں، یہ صورت اپنے مشرکانہ عقیدہ کی وجہ سے کفر ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ پڑھنے والا یہ گمان کرے کہ ان کلمات کے موکل ان الفاظ کو جب منادی۔ شیخ عبد القادر جیلانی تک پہنچا دیں گے اور وہ حضرت حق سے دعا اور التجا کر کے میرے مقصد کی کار برآری فرما دیں گے، لفظ شیئاً للہ سے یہی معنی سمجھ میں آتے ہیں، اس صورت میں شرعاً کوئی خرابی نہیں ہے، صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اللہ کا ایک فرشتہ ایسا ہے جس کو حق تعالیٰ تمام مخلوق کی آواز میری قبر کے قریب پہنچاتے ہیں اور وہ (فرشتہ) ہر اس شخص کا سلام مجھے پہنچاتا ہے جو میری امت میں سے مجھ پر سلام بھیجے، ایک اور صحیح حدیث میں آیا ہے کہ میری امت کے اعمال میرے پاس قبر میں پیش کیے جاتے ہیں اگر وہ اچھے عمل ہوتے ہیں تو میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اگر برے ہوتے ہیں تو ان کے لیے استغفار کرتا ہوں" اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارثان میں سے بعض اولیاء کو بھی یہ مقام عطا فرما دیا جائے تو کیا تعجب ہے،

[1] رواہ الترمذی ولفظہ "اللھم انی اسئلک واتوجہ الیک بنبیک محمد نبی الرحمۃ انی توجھت بک الی ربی فی حاجتی ھذہ لتقضی لی اللھم فشفعہ فی" وقال الترمذی ھذا حدیث حسن صحیح غریب لا نعرفہ الا من ھذا الوجہ ترمذی ص ۱۹۷/۲ مجتبائی ۱۳۲۸ھ ورواہ ابن ماجہ والحاکم فی مستدرکہ مرقاۃ ملا علی القاری ص ۲۵۳/۵، امدادیہ ملتان ۱۳۰۸ھ وراجع کنز العمال ص ۱۹۳/۱۲ طبع جدید،

تیسری صورت یہ ہے کہ پڑھنے والا یہ اعتقاد کرے کہ ان بزرگ کا نام میں وظیفہ کے طور پر پڑھ رہا ہوں اگرچہ وہ بزرگ میری آواز نہیں سن سکتے اور نہ ہی میرے مقصد کو پورا کر سکتے ہیں لیکن خدا تعالیٰ تو سنتے ہیں اور وہ بزرگ خدا کے محبوب ہیں اللہ کی اپنے محبوب کے حال پر جو عنایت ہے اس کی وجہ سے اس کے وسیلہ اور ان کا ذکر کرنے سے میری مشکل کو آسان فرما دے، جیسا کہ تشہد میں جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو حرف ندا کے خطب "السلام علیک ایھا النبی" کو اسی پر محمول کیا گیا ہے،

اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص کسی بادشاہ یا رئیس کے ناسمجھ بچے سے کوئی چیز طلب کرے اور وہ بچہ نہ اس چیز کو سمجھتا ہے اور نہ اس کے دینے پہ قدرت رکھتا ہے لیکن اس بچہ کا شفیق و فیاض باپ اس سائل کے مقصد کو۔ وہ چیز دے کر۔ پورا کر دیتا ہے یعنی وہ سوال اس بچہ سے نہیں در حقیقت اس کے باپ سے ہے، صحیح حدیث میں آیا ہے کہ حصول مقاصد کے لیے اس طرح سے دعا کرے "اے اللہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں آپ کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی التوبہ کے واسطہ کہ آپ میرے ساتھ ایسا ایسا معاملہ فرمائیے پھر دعا کرنے والا یہ الفاظ کہتے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کے ذریعہ سے آپ کے رب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ ایسا ایسا معاملہ فرمائے[۱]"

سوال نمبر۲

سوال:۔ ازبسکہ دیار هندوستان مقرر کردن مہر زیادہ از قدر وسعت رواج عام یافتہ، لیکن از اں جا کہ مرد و زن ہیچ تفرقہ و تمیز در مال خود نمیکنند بلکہ مرد تمام مال و اسباب خانہ را بجوۂ خود و زن آنہمہ را بجوۂ خود نسبت میکنند، ہیچ خیال

[۱] جواب میں نادعلی پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے،

و وہم ادائے دین مہر در خاطر خطور نمی کنند، پس کسانیکہ از طرف آمدنی و اسباب اینقدر دسترس دارند کہ جمیع اسباب امارت مثل فیل و اسپ و شتر وغیرہ مہیا می دارند، و در سال تمام صدہا روپیہ خرچ می سازند، فاما ایں قدر نقدی کہ از اں دین مہر زوجہ ادا کردہ شود، بالفعل جمع نہ دارند، و اگر ارادہ ادائے دین مہر بخیال آرند بآمدنی و تا مدت ادا کفل نمی توانند فاما بسبب اینکہ بحسب رواج بود[۱]... دین واجب الادائی بخاطرایشان نمی گزرد، چیزے از ایں منع نمی کنند، و بلکہ زناں ہم گرفتن مال مہر خود را از شوہر خود کمال خلاف مروت می شمارند پس شرعا ایں چنیں اشخاص در باب فضیلت حج و وجوب صدقہ فطر ادا شدن زکوٰۃ دیگراں از دادن ایشاں چہ حکم دارند؟ و حال آنکہ دیگراں ایشاں را و ایشاں بخیال خود خود را امیر می دانند، و ایں طمع بخاطر خود ندارند کہ ایشاں را بوجہ اللہ چیزے بدہد، بلکہ گرفتن چیزے را کہ بطور صدقہ نباشد بلکہ بطور نذرانہ باشد الکل هتک حرمت خود میدانند، بینوا توجروا۔

ترجمہ سوال :۔ ہندوستان میں وسعت سے زیادہ مہر مقرر کرنے کا عام دستور ہے، لیکن ایسی صورت میں جب کہ مرد و عورت اپنے مال میں آپس میں کوئی فرق اور پہچان نہیں کرتے، بلکہ تمام مال اور مکانات کو مرد اپنا اور عورت ان سب کو اپنی ملکیت خیال کرتی ہے اور کبھی کوئی ارادہ و خیال مہر کی ادائگی کا نہیں کرتے پس وہ اشخاص جو آمدنی و اسباب کے لحاظ سے ایسے باحیثیت ہوں کہ تمام اسباب امارت مثلاً ہاتھی، اونٹ، گھوڑے وغیرہ رکھتے ہوں اور تمام سال میں سیکڑوں، ہزاروں روپے خرچ کر دیتے ہوں لیکن اتنی رقم نقد کہ جس سے بیوی کا مہر ادا کیا جا سکے جمع نہیں رکھتے اور اگر اس مہر کی ادائگی کا ارادہ کریں تو جب تک مہر ادا کریں اس وقت تک ان کی آمدنی بیوی کے اخراجات کا تکفل نہیں کر سکتی، اور یہ عام رواج کی وجہ سے

[۱] لفظ کرم خوردہ ہے[۲] یہ لفظ پوری واضح نہیں ہو سکا ہے،

ہے کہ اس مہر کی ادائیگی کا کسی کو خیال نہیں آتا اور کوئی چیز انہیں اس کے ادا کرنے سے روکنے والی نہیں ہے بلکہ عورتیں شوہر سے اپنا مہر وصول کرنا بے مروتی سمجھتی ہیں، پس شرعاً ایسے اشخاص پر حج کے فرض، صدقۂ فطر کے واجب ہونے اور ان کو دینے سے زکوٰۃ کے ادا ہو جانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور حال یہ ہے کہ عوام ان اشخاص کو اور یہ خود بھی اپنے کو امیر خیال کرتے ہیں اور اسے پسند نہیں کرتے کہ کوئی شخص انہیں اللہ واسطے کوئی چیز دے اور ایسی چیز کا لینا بھی جو بطور ہدیہ کے نہ ہو بلکہ نذر و نیاز کی ہو اپنی سخت توہین سمجھتے ہیں؛

جواب:۔ موافق ظاہر قواعد فقہ ایں قسم دین مانع فرضیت حج و وجوب زکوٰۃ و صدقۃ الفطر و مبیح گرفتن زکوٰۃ از دیگراں می باشد لیکن از روئے تقویٰ و تورع ادائے حج و دادن صدقۃ الفطر و زکوٰۃ ایشاں را باید کہ بعمل آرند زیرا کہ در صورت مذکورہ زن ہرگز مطالبہ مہر خود نمی کنند و از ادائے آں دین مخطور خاطر ایں کس است پس عند اللہ احتیاط در ہمیں است کہ ایں چیز ہا را ادا نماید و زکوٰۃ دیگراں نہ گیرد زیرا کہ ایں دین مانند دین خدا شد از زکوٰۃ سالہائے و از نذر و کفارات و دین خدا منع نمی کند از وجوب ایں چیز ہا در شرح وقایہ میگوید

"ومدیون مطالب من عبد بقدر دینہ لان ملکہ غیر فاضل عن الحاجۃ الاصلیۃ وھی قضاء الدین وانما قید بکونہ مطالباً من عبد ...... حتی لو کان مطالباً من اللہ تعالیٰ لا یمنع وجوب الزکوٰۃ کمن ملک نصاباً بعضہ مشغولاً بدین اللہ کالنذر او الکفارۃ او الزکوٰۃ ...... تجب فیہ الزکوٰۃ ولا یشترط لوجوب الزکوٰۃ فراغہ عن ھذا الدین"[1]

وفی الفتاوی العالمگیریۃ "ومنھا القدرۃ علی الزاد والراحلۃ بطریق الملک او الاجارۃ"[2] "وتفسیر ملک الزاد والراحلۃ ان یکون لہ مال فاضل عن حاجتہ وھو ما سوی مسکنہ ولبسہ وخدمہ واثاث بیتہ؛ قدر ما یبلغہ الی مکۃ ذاھباً وجائیاً راکباً لا ماشیاً وسوی ما یقضی بہ دیونہ ویمسک لنفقۃ عیالہ ومرمۃ مسکنہ ونحوھا الی وقت انصرافہ"[ع]

فی الدر المختار "تجب صدقۃ الفطر موسعاً فی العمر کزکوٰۃ وقیل مضیقاً فی یوم الفطر عیناً　علی کل مسلم ذی نصاب فاضل عن حاجتہ الاصلیۃ کدینہ وحوائج عیالہ وان لم ینم وبہ یحرم الصدقۃ"[3]

الرحیم لہ
(ھو العزیز الولی)
مہر

ترجمہ جواب:۔ قواعد شرعیہ کی رو سے اس قسم کا قرض بظاہر وجوب زکوٰۃ اور وجوب صدقۃ الفطر کو مانع ہے اور ایسا قرض ذمہ ہونے کے وقت زکوٰۃ لینی بھی

---

[1] شرح وقایہ بحاشیہ عمدۃ الرعایہ ص ۲۶۹ ج ۱ مجتبائی ۱۳۲۷ھ [2] جو لہ یہ مسلسل عبارت نہیں ہے درمیان سے چند سطریں شاہ صاحب نے حذف فرما دی ہیں اس کے بعد عبارت "تفسیر ملک الزاد والراحلہ" ہے [ع] فتاویٰ عالمگیری ص ۳۰۵ و ص ۳۰۶ اول ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۲۵۸ھ یہ گذشتہ عبارت کی طرح یہ عبارت بھی حذف و اختصار کے بعد نقل فرمائی ہے، مکمل کے لیے دیکھئے [3] درمختار (برحاشیہ شامی) ص ۲۱ و ص ۸۳ دوم مجتبائی دہلی ۱۲۸۶ھ

جائز ہو گی، لیکن تقویٰ و احتیاط سے ایسے لوگوں کو چاہیے کہ حج، زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر ادا کریں، اس لیے کہ ایسی صورت میں عورت ہرگز اپنے قرض ۔ مہر کا مطالبہ نہیں کرے گی اور نہ ہی اس قرض کی ادائیگی اس شخص کے وہم و خیال میں ہے۔ اس لیے عنداللہ احتیاط اسی میں ہے کہ ان چیزوں ۔ خدا کے قرض، حج، زکوٰۃ وغیرہ کو ادا کرے اور زکوٰۃ کی رقم نہ لے اور نہ اپنے خرچ میں لائے، اس لیے کہ سب خدا کے قرض کی طرح ہے، گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ نذر و کفارات اور خدا کا قرض ان چیزوں کے واجب ہونے کو منع نہیں کرتا۔ شرح وقایہ میں ہے کہ

"اور جس شخص کے ذمہ کسی انسان کا قرض ہو، اس پر بھی حج فرض نہیں، اس لیے کہ اس شخص کی ملکیت ۔ رقم ۔ ضرورت اصلیہ سے زیادہ نہیں ہے، اور روہ ضرورت قرض ادا کرنا ہے، انسان کا مقروض ہونے کی شرط کا اس لیے اضافہ کیا کہ اگر اس کے ذمہ اللہ کا کوئی مطالبہ ہے تو اس مطالبہ کی وجہ سے زکوٰۃ کا وجوب متاثر نہیں ہوگا، جیسے کوئی شخص نصاب زکوٰۃ کا مالک ہے اور اسی نصاب کی رقم میں سے کوئی نذر یا کفارہ بھی ادا کرتا ہے تو اس رقم میں بھی زکوٰۃ فرض ہے، زکوٰۃ کی فرضیت کے لیے اس قرض خداوندی سے فارغ ہونا شرط نہیں ہے" فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ

"حج کے فرض ہونے کی شرطوں میں سے یہ بھی ہے کہ زاد سفر اور سواری کی استطاعت بھی رکھتا ہو، سواری کا مالک ہو یا سواری کرایہ پر لے سکے، زاد سفر اور سواری کا مالک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس اپنی ضروریات یعنی مکان، ملبوسات خادم اور خادم کے خرچ سے زیادہ اتنا مال ہو جس سے سواری کے ذریعہ مکہ کا سفر کر سکے، پیدل جانے کا اعتبار نہیں، یعنی اگر کوئی بغیر سواری کے پیدل سفر

کر سکتا ہے تو وہ شرعاً مکلف نہیں، اور یہ تمام رقم، قرض کے علاوہ ہو، یہ شخص کسی کا مقروض بھی نہ ہو، اور اس کے پاس اتنی رقم ہو جو حج سے واپس آنے تک اس کے اہل و عیال کے خرچ، مکان کی مرمت اور اس طریقہ کے ضروری اخراجات سے بھی زیادہ ہو۔"

درمختار میں ہے کہ "صدقۂ فطر واجب ہے اور اس کے تمام عمر میں کسی بھی وقت ادا کرنے کی اجازت ہے، زکوٰۃ کی طرح، کہا گیا ہے کہ صدقۂ فطر کی ادائیگی کے لیے عید کا دن معین ہے، ہر آزاد مسلمان پر جو نصاب زکوٰۃ کا مالک ہو، اور وہ نصاب اس کے ضروری اخراجات جیسے قرض اور اہل و عیال کے خرچ سے زیادہ ہو، اگرچہ نصاب نام ہو اور اس نصاب کا مالک ہونے کی وجہ سے اس کو صدقہ لینا حرام ہے"

(مہر ہو العزیز الولی الرحیم ۱۱۸۹ھ)

شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کی تصدیق کی ہوئی ایک دستاویز!

یہ دستاویز فارسی میں ہے، ۴۴½ طویل اور ۳۵ سینٹی میٹر چوڑے کاغذ پر نہایت خوبصورت اور جلی قلم سے لکھی ہوئی ہے، اس دستاویز کے فارسی متن کا خلاصہ یہ ہے کہ

"مولانا حکیم محمد عرف شیخ الاسلام کاندھلوی کی جائیداد ان کے صاحبزادگان مفتی الٰہی بخش، مولانا شاہ کمال الدین، مولانا محمود بخش، اور مہر النساء کے درمیان تقسیم شدہ نہیں ہے" لیکن پروانہ جات صدر الصدور عبد الغنی خاں اور کتاب صاحبان انگریز" میں اندراج سب کے نام الگ الگ کردی گئی ہے، جیسا کہ فرامین میں ہوتا ہے، اس لیے وارثان مولانا محمد شیخ الاسلام میں سے کسی کو بھی ان اندراجات کی وجہ سے کسی خاص زمین پر ملکیت کا دعویٰ نہیں ہے"

حاشیہ پر اہل معاملہ اور گواہان کے دستخط اور مہریں ثبت ہیں، پہلی تحریر اور گواہی شاہ عبد العزیز کی ہے تحریر فرماتے ہیں:۔

"باقرار مقرین مذکورین بالمواجہہ مہر نمودہ شد" مہر ہو العزیز الولی الرحیم

دوسری شہادت شاہ رفیع الدین نے ان الفاظ میں ثبت فرمائی ہے

"فقیر رفیع الدین بریں مضمون مطلع است" مہر رفیع الدرجات ذو العرش ۱۱۹۲ھ اس کے بعد مفتی الٰہی بخش، مولانا شاہ کمال الدین، مولانا محمد بخش مولانا حکیم محمد اشرف کی مہریں اور دستخط ہیں، یہ تحریر ۴ ربیع الثانی سنہ جلوس محمد اکبر شاہ بادشاہ مطابق ۱۲۲۵ھ (۱۶ اپریل ۱۸۱۰ء) کو لکھی گئی،

سلسلۂ تذکرۃ المحدثین

عہد رسالت اور اس کے بعد کے ہر دور میں احادیث نبوی کی نقل و روایت کا سلسلہ برابر جاری رہا، یہ احادیث تمام دنیائے اسلام میں بکھری ہوئی تھیں محدثین کرام کا امت پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ایسے زمانہ میں جب کہ آج کل کی طرح سفر کی سہولتیں میسر نہ تھیں، نہ نشر و اشاعت کے اتنے وسیع وسائل موجود تھے، دنیائے اسلام کا ایک ایک چپہ چھان کر ان احادیث کو جمع کیا، ان کے مجموعے مرتب کیے، ہزاروں لاکھوں رواۃ کے حالات قلمبند کیے، جرح و تعدیل کا فن ایجاد کیا، سید صاحب کو اپنی آخر زندگی میں امت کے اسی برگزیدہ طبقہ یعنی محدثین کرام کے حالات مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا، ان کو اس موضوع سے خود بھی دلچسپی تھی، ان کی وفات کے بعد یہ کام مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے سپرد کیا گیا، جو اسکو انجام دے رہے ہیں اس کے دو حصے شائع ہو چکے ہیں، تیسرا اور چوتھا حصہ زیر ترتیب ہے، آخری حصہ ہندوستان کے محدثین کرام کے حالات و سوانح اور ان کی حدیثی خدمات اور کارناموں پر مشتمل ہوگا،

قیمت حصہ اول ۵، ۱۳ قیمت حصہ دوم ۵، ۱۳

گجرات کے ایک نامور محدث و مورخ

از

محمد منصور نعمانی ندوی رفیق دار المصنفین

کسی بھی ملک کی شہرت و عظمت کا دار و مدار علوم و فنون کی ترقی میں مضمر ہے، یہی وجہ ہے کہ گذشتہ صدیوں میں سلاطین کے درباروں میں صاحب فضل و کمال علماء کا منتخب مجمع نظر آتا ہے جنھوں نے بادشاہوں کی فیاضی اور علم دوستی کی بدولت تصانیف کا انبار لگا دیا تھا، اس سلسلہ میں سلاطین گجرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں، علوم فنون کی ترقی میں ان کے قدم کسی سے پیچھے نہیں رہے، انھوں نے اپنے بے مثال کارناموں، ملکی اصلاحوں اور صنعت و حرفت کی ترقیوں کے ساتھ صوبۂ گجرات کو دار العلوم والفنون بنا دیا تھا، ان کی فیاضی و علم نوازی نے اس خطہ کو زین البلاد کا مرتبہ عطا کیا، ان بادشاہوں نے اپنی تقریباً دوسو سال کے عہد حکومت میں علوم و فنون کی ایسی سرپرستی کی کہ گجرات دہلی سے بھی گوئے سبقت لے گیا، علماء کی قدردانی و عزت افزائی سے اطراف و جوانب ہی کے نہیں بلکہ ہندوستان سے باہر کے علماء بھی گجرات میں کھنچ کر آگئے، انھوں نے یہاں توطن اختیار کیا اور اپنے فیوض و برکات سے اس خطہ کو مالا مال کر دیا، ان کی بدولت گجرات حدیث و قرآن کے نغمات سرمدی سے گونجنے لگا، ہندوستان میں اشاعت حدیث کا سہرا شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے سر سمجھا جاتا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ جب شیخ محدث عالم وجود میں

بھی نہ آئے تھے، اس وقت گجرات حافظ سخاوی (متوفی ۹۰۲ھ) شیخ الاسلام زکریا انصاری (متوفی ۹۲۶ھ) اور علامہ ابن حجر مکی متوفی ۹۷۳ھ کے تلامذہ کے وجود مسعود سے منور تھا اور علامہ وجیہ الدین محمد بن محمد المالکی متوفی ۹۲۹ھ علامہ بحرق ۹۳۰ھ، شیخ عبد المعطی باکثیر ۹۹۸ھ. شہاب الدین احمد العباسی مصری متوفی (۹۹۲ھ) شیخ فاکہی متوفی ۹۹۲ھ سید شیخ بن عبد اللہ عیدروسی متوفی ۹۹۰ھ شیخ سعید حبشی متوفی ۹۹۱ھ، قاضی وجیہ الدین علوی متوفی ۹۹۸ھ، قطب الدین نہروالی مفتی مکہ متوفی ۹۹۰ھ راجح ابن داؤد گجراتی وغیرہ علم حدیث کی مشعل روشن کئے ہوئے تھے،

دسویں اور گیارہویں صدی گجرات کی بڑی سدابہار صدیاں تھیں، اس مبارک زمانہ میں یہ علاقہ انفاس قدسیہ کا ایک عظیم مرکز بھی تھا، یہاں مشائخ چشت، مشائخ سہروردیہ سلسلۂ مغربیہ، رفاعیہ، قادریہ، نقشبندیہ، شطاریہ اور عیدروسیہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا،

اسلامی تہذیب و تمدن کے عہد عروج میں جن ہزاروں نفوس قدسیہ نے اپنی زندگیاں قربان گاہ علم پر نثار کی ہیں، ان میں سے کچھ تو نگاہوں کا مرکز بن گئے لیکن ہزاروں اصحاب فضل و کمال ایسے بھی ہیں، جن کو یا تو ہم نے حافظہ سے نکال دیا یا وہ ہمارے تغافل کا شکار ہو گئے، اس خاکستر میں بعض ایسی شخصیتیں بھی ہیں کہ اگر ان کو منظر عام پر لایا جائے تو آسمان علم و ادب کے بہت سے تابندہ ستارے ماند پڑ جائیں گے ذیل میں ایک ایسی ہی شخصیت کا ذکر کیا جا رہا ہے، جس نے اپنی معلومات کی وسعت تحقیقات کی ندرت اور علمی فضیلت کے سبب معاصرین اور متاخرین سے خراج تحسین

وصول کیا، اور اپنے بعد کتابوں کا ایک ذخیرہ چھوڑ گیا، جس کی وجہ سے بزم علم و ادب میں آج بھی اس کا نام عقیدت و محبت سے لیا جاتا ہے، وہ پوری عمر جادۂ علم و تحقیق پر گامزن رہا، حدیث و سیر اخلاق و تصوف، اور تاریخ و سوانح اس کا خاص موضوع تھے، انکی مایہ ناز تصنیف "النور السافر عن اخبار القرن العاشر" ان کے فضل و کمال کی شاہد ہے، ذیل میں ان کے اوراق حیات اور ان کی خدمات جلیلہ کی مرقع کشی کی جا رہی ہے،

نام و نسب عبد القادر نام، ابوبکر کنیت، اور محی الدین لقب ہے[1] مسلک کے اعتبار سے شافعی اور سلسلہ تصوف کے لحاظ سے عیدروسی تھے،

ولادت انھوں نے اپنی سوانح حیات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ربیع الاول ۹۷۸ھ میں میری ولادت ہوئی، والد محترم نے ولادت کے سلسلہ میں مختلف تاریخیں نوٹ کر لی تھیں، ان میں سے ایک "شیخ بمولود سید قطب زمانہ" ہے[2] مختلف شعراء نے جو تاریخیں کہی تھیں، وہ النور السافر میں دیکھی جا سکتی ہیں، انھوں نے اپنی ولادت اور لقب (کنیت) کے بارے میں ایک منامی بشارت یوں نقل کی ہے "میری ولادت سے نصف ماہ قبل میرے والد نے اولیاء کرام کی ایک جماعت کو خواب میں دیکھا، ان میں شیخ عبد القادر جیلانی، اور شیخ ابوبکر العیدروس تھے، شیخ جیلانی نے میرے والد سے کچھ مطالبہ کیا، والد نے اس خواب کی تعبیر کے طور پر میری کنیت ابوبکر اور لقب محی الدین تجویز کیا[3]

والد شیخ عبد القادر کے والد شیخ بن عبد اللہ عیدروسی اپنے وقت کے یگانۂ روزگار

[1] خلاصۃ الاثر ۲۴۲/۲ [2] النور السافر ۳۳۴ [3] النور السافر

عالم وصوفی تھے، آپ کی ولادت ۹۱۹ھ میں تریم میں[1] ہوئی تعلیم و تربیت اپنے وطن میں حاصل کی، اس کے بعد حرمین شریفین میں شیخ ابن حجر مکی کی خدمت میں سماع حدیث کی پھر زبید کا سفر کیا، اور علامہ ربیع کی صحبت میں علم وادب میں کمال پیدا کیا[3] ۹۵۸ھ میں شیخ بن عبد اللہ نے رخت سفر باندھا، اور ہندوستان کے خوش قسمت خطہ گجرات کے شہر احمد آباد میں وارد ہوئے، اور یہیں توطن اختیار کر لیا، اور اپنے فیض ظاہری و باطنی سے مخلوق خدا کو فائدہ پہونچایا، یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے عیدروسی سلسلہ سے ہندوستان کو روشناس کیا، اور اس سلسلہ کو ہندوستان میں فروغ دیا[4] شیخ تصوف

---

[1] تریم شمالی حضرموت کے اہم شہروں میں تھا، یہ شہر اس بڑی وادی کے بائیں جانب واقع ہے جو سارے حضرموت سے ہو کر گذری ہے، اور جسے شبام کے مشرق میں وادی نبیلہ یا وادی حضرموت کہتے ہیں، عرب جغرافیہ دانوں نے حضرموت میں دو بڑے شہروں کا ذکر کیا ہے، شبام اور تریم، صاحب معجم البلدان نے اس ذیل میں اعشیٰ اور کثیر کے اشعار بھی نقل کیے ہیں (معجم البلدان ۲/۳۸۵) زمانہ قدیم میں تریم حضرموت کی صنعت پارچہ بافی کا بڑا مرکز تھا طلائی حاشیے والی ریشمی شالیں وہاں کی مشہور تھیں، زمانہ سابق میں یہ علم وادب کا بھی بڑا مرکز رہا ہے، نحو، ادب، حدیث، فقہ، تفسیر کے نامور ائمہ یہاں پیدا ہوئے، تجارت میں بھی اس کی بڑی شہرت رہی ہے، ہندوستان کے ساتھ اس کے تجارتی روابط تھے، حضرموت کے جو لوگ بغرض تجارت تلنگ و حضارمہ عرب کہلائے، تریم اور تبریم دو الگ جگہوں کا ذکر کیا جاتا ہے، جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تریم حضرموت کا ایک قلعہ ہے اور تریم ایک معروف و مشہور مقام ہے (ملخص دائرہ معارف اسلامیہ ۶/۹۳)، [2] معاریف الهند و البیان عربی) صفحہ ۱۰۱ النور السافر ص ۳۷۵ [3] سلسلۂ عیدروسی کے بانی سید عفیف الدین عبد اللہ عیدروس کبیر ہیں، اس سلسلہ کی اساس

میں اس بلند حیثیت کے ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی اعلیٰ ... رکھتے تھے، اور اس میدان میں بھی ان کی بہت سی یادگاریں، العقد النبوی السر المصطفوی، الفوز البشری، تحفۃ المرید کی دو شرحیں، رسالۂ معراج، الحزب النفیس وغیرہ کی شکل میں موجود ہیں، علامہ ربیع کی صحبت نے ان کے ادبی ذوق کو جلا بخشی تھی، ان کے اشعار کے نمونے النور السافر میں دیکھے جا سکتے ہیں، عربی کا ایک دیوان ان سے منسوب ہے، تبرک کے لیے دو شعر پیش کیے جاتے ہیں

حجاب من اللہ وحرز رفیع   علینا دواما وفضل وسیع

اللہ کا سایہ اور اس کا فضل و کرم ہر لمحہ ہم پر سایہ فگن ہے

وحسبی ربی لطیف بدیع   علیم بحالی بصیر سمیع[1]

میرے لیے میرا پروردگار کافی ہے وہ پاک میرے حال کا سننے جاننے والا ہے، عبد القادر عیدروسی نے ان کے کمالات و مناقب کو فتوحات القدوسیۃ فی الخرقۃ العیدروسیۃ کے مقدمہ میں بہ تفصیل لکھا ہے، ۹۹۰ھ میں اس دار فانی سے کوچ کیا[2] صحن خانہ میں دفن کیے گئے، قبر لوگوں کی عقیدت کا مرکز ہے[3] قبہ کی تاریخ تکمیل انھوں نے "محل الفیض" ۹۹۹ سے حروف سے نکالی، قطعہ تاریخ کا آخری شعر یہ ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴۰) عبد اللہ عیدروس کے چچا ابو بکر عیدروس، ابو بکر عیدروس کے والد سید عفیف الدین عیدروس ہیں، جب ان کا احمد آباد میں انتقال ہو گیا تو ان کے بیٹے عبد القادر، ان ہوئے، اور موت میں اس سلسلہ کو ان کے پوتے شیخ محمد بن عبد اللہ اور پھر شیخ جعفر علی بن عبد اللہ بن شیخ نے سنبھالا، یہاں تک کہ یہ سلسلہ گجرات و دکن کے اکثر علاقوں میں پھیل گیا، (الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند مطبوعہ دمشق ص ۱۸۶-۱۸۷) [4] الانتباہ فی سلاسل اولیاء ص ۱۲۷ [1] النور السافر ص ۳۷۷ [2] نزہۃ الخواطر ۵/۲۳۵، [3] معاریف الهند ص ۱۸

کثرت فیضها قد جاء ضبطا　　محل الفیض تاریخ البناء[1]

(صاحب قبر کے کثرت فیض سے اس کی تاریخ بنا محل الفیض کے حروف سے نکلتی ہے)

والدہ ماجدہ شیخ عبدالقادر کی والدہ بھی بڑی صاحب کرامات تھیں، ان کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں

"میری والدہ ام ولد تھیں، شاہی گھرانہ کی بعض عورتوں نے ان کو میرے والد کو ہبہ کیا تھا، اور ان کو بڑے عطیات، ساز و سامان اور مکانات سے نوازا تھا، ان کی خدمت پر کنیزیں مامور تھیں، شاہی گھرانے کی عورتیں ان کو اپنی بیٹی کی طرح مانتی تھیں، وہ خود ان کی مزاج پرسی کے لیے مہینہ میں کئی بار آتیں، میری والدہ ماجدہ بہت نیک اور خدا ترس خاتون تھیں، تواضع، فیاضی، سیر چشمی اور حسن اخلاق میں وہ اپنی مثال آپ تھیں، ان کا انتقال جمعہ کے دن رمضان المبارک سنہ [illegible]ھ میں ہوا، انتقال کے وقت ان کی زبان پر کلمۂ طیبہ کا ورد تھا، یہ خاتمہ بالخیر کی واضح دلیل ہے، ان کی قبر میرے والد کی قبر کے باہر ہے"[2]

تعلیم و تربیت شیخ عبدالقادر علوم ظاہری و باطنی کے رمز شناس تھے، تعلیم کا آغاز قرآن پاک سے ہوا، اور اسے بعض اولیاء اللہ سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، اس کے بعد تحصیل علم میں مشغول ہوئے، احمد آباد ہی کے بعض مشاہیر سے اکتساب فیض کیا، بعض علوم کا درس اپنے والد شیخ ابن عبداللہ سے لیا، اور اوائل عمری میں محدث زمانہ شیخ عبدالمعطی باکثیر کے حلقۂ حدیث میں صحیح کی سماعت کی، اور اجازت سے سرفراز ہوئے

۱؎ النور السافر ص ۵۹ ۲؎ ایضاً ص ۳۳۶ ۳؎ ایضاً ص ۳۴۶

تحصیل علم کے لیے انھوں نے دو بڑے دور کے سفر بھی کیے، سنہ ۹۹۸ھ میں جیول کا سفر کیا، وہاں [illegible] تک قیام کیا، اور علامہ محمد سقری، ابن السلام علی سقری، شیخ عبدالقادر بن خندوم الخطیب جیسے یگانۂ روزگار اصحاب سے استفادہ کیا، اور پھر دوبارہ احمد نگر میں تحصیل علم کے لیے گئے، کامل چار سال کی رحلت علمی کے بعد سنہ ۱۰۰۱ھ میں احمد آباد واپس ہوئے، اور پھر درس و افادہ کی مجلس گرم کی، وہ کہتے ہیں کہ جب مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ میرے سردار شیخ عبداللہ عیدروس نے فرمایا ہے کہ جس نے احیاء علوم الدین امام غزالی کو چالیس مرتبہ پڑھا تو میں اللہ کے بھروسہ پر اس کی جنت کی ضمانت دیتا ہوں، تو میں نے اسی نیت سے اس کو پڑھا، اور اس کے ساتھ اولیاء کرام کی صحبتوں اور علماء کی مجلسوں سے بہت کچھ حاصل کیا"[1]

راہ سلوک علوم ظاہری میں کمال کے بعد علوم باطنی کی تحصیل کی طرف متوجہ ہوئے، اور مشائخ عظام کے فیض صحبت سے اس راہ میں وہ مقام حاصل کر لیا جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، پہلے مربی ان کے والد ماجد تھے، ان کے بعد چچا زاد بھائی حاتم بن احمد العدل نے ان پر اسرار و رموز کے در کھولے، پھر قطب وقت شیخ عبداللہ بن شیخ العیدروس سے فیضان حاصل کیا، یہ ان کے چچا تھے، انھوں نے خرقۂ تصوف عطا کیا، اور اجازت سے سرفراز فرمایا، چوتھے درویش حسن کشمیری، پانچویں شیخ موسیٰ بن جعفر کشمیری، اور چھٹے ولی کامل محمد بن الشیخ حسن تھے[2]

فیض باطنی متذکرہ بالا شیوخ سے کسب فیض کے بعد انھوں نے مسند تلقین و ارشاد کو زینت بخشی، سیکڑوں افراد نے اس سرچشمۂ فیض سے سیرابی حاصل کی، جن کا پھر ذکر ہوگا[3]

۱؎ النور السافر ص ۵۹ ۲؎ ایضاً ص ۳۳۶ ۳؎ الزہر الباسم بحوالہ خلاصۃ الاثر ۲/۴۴۲

درس و تدریس | علوم ظاہری و باطنی کے ساتھ ان کی مسند ارشاد و تلقین اور تعلیم و تدریس کی خدمت بھی انجام دیتے تھے اور ان کے کاشانے بیک وقت مدرسے بھی تھے اور خانقاہیں بھی، عیدروسی نے بھی اکابر کے اس طریقہ کو جاری رکھا، یہ ضرور ہے کہ ان کی زندگی کا روحانی پہلو اتنا پرکشش اور جاذب نظر تھا کہ ان کا شمار مشائخ میں ہوا، اور تذکرہ نگاروں نے اسی حیثیت سے ان کا تذکرہ لکھا، اس طرح ان کی علمی حیثیت دب کر رہ گئی، اور درس و تدریس کی زیادہ تفصیل نہیں ملتی ہے، مگر خود انھوں نے ذکر کیا ہے کہ وہ حدیث رسول ﷺ کا درس بڑی ذوق اور توجہ سے دیا کرتے تھے، ۹۹۸ھ کے واقعات میں تحریر کرتے ہیں کہ

جب اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق ارزانی فرمائی تو میں نے بخاری شریف کے درس کو لازمۂ حیات بنا لیا، اب تک چالیس سے اوپر ختم کرا چکا ہوں، اس درس کی اطراف و اکناف میں بڑی شہرت ہوئی اور اسمیں شرکت کے لئے مخلوق کا اژدحام ہوتا تھا،

مسلک | حضرموت شافعی مذہب کا بڑا مرکز تھا، امام شافعی نے وہاں کافی عرصہ تک قیام کیا تھا اور ان کے شاگردوں نے بھی وہیں رہ کر فقہ شافعی کی تدوین و اشاعت کی حضرموت میں بھی شافعی مذہب کا عام رواج تھا، عیدروس کے والد بھی شافعی تھے، وہ حضرموت سے ہندوستان آئے تو انھوں نے اور ان کے بعد ان کے صاحبزادے عبدالقادر نے شافعی مذہب کی تدوین و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا، ان کے اس تعلق خاطر کا اثر ہے کہ النور السافر میں شوافع کا ذکر بہت زیادہ ہے، ان کے علاوہ علماء احناف کا ذکر کم ہے اس کی وجہ سے کتاب کی جامعیت میں بڑا فرق ہو گیا ہے۔

ذوق شعر و سخن | اگرچہ ان کی زیادہ تر توجہ، حدیث، تفسیر، فقہ، سیرت اور تصوف پر مرکوز رہی لیکن تفنن طبع کے لیے گاہے ماہے شاعری کی جانب بھی توجہ کر لیا کرتے تھے لیکن دیگر علوم و فنون جو ان کے لئے وجہ افتخار تھے ان کو نظر انداز کبھی نہیں کیا، وہ ایک مایۂ ناز مورخ علامۂ دوران اور صوفی باصفا تھے اس لیے ان کے اشعار لطافت کے ساتھ موعظت و حکمت کا خزینہ اور اسرار و رموز کا گنجینہ ہیں، افسوس ہے کہ ان کا دیوان دست برد زمانہ کی نذر ہو گیا

کتب خانہ | عبدالقادر عیدروسی نے ارشاد و تلقین کے ساتھ تصنیف و تالیف کو زندگی بھر جاری رکھا، اور بیش قیمت کتابیں تحریر کیں، تاریخ تذکرہ، سیرت، اور دیگر موضوعات پر تصنیف و تالیف کے لیے کتابوں کے ایک ذخیرہ کی ضرورت تھی، اس بنا پر ان کے یہاں ایک بڑا کتب خانہ تھا۔ (یاد ایام ص ۶۸)

صاحب معجم اس سلسلہ میں لکھتے ہیں،

انھوں نے مفید کتابوں کے جمع کرنے پر ہمت باندھی اور اس سلسلہ میں دوسرے ملکوں سے تلاش کرائیں اس طرح ان کے پاس ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا اس کے ساتھ ان کے والد کی بھی بڑی کتابیں ان کے پاس تھیں[1]

وفات | شیخ عبدالقادر ساٹھ سال تک گجرات کو ارشاد و تلقین کا مرکز بنائے رہے، ہزاروں تشنگان علم اس چشمۂ فیض سے سیرابی حاصل کرتے رہے[2] تا آنکہ ۱۰۳۸ھ میں ان کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا، اور احمد آباد میں اپنے باپ کے پہلو میں سپرد خاک کیئے گئے، مزار مرجع انام ہے، بجولا ابو ظفران کی جائے قبر

[1] معجم المطبوعات ۲/۱۴۰۰ [2] خلاصۃ الاثر ۴/۴۴۲

کے بارے میں رقمطراز ہیں "احمد آباد سول اسپتال سے مشرق کو جو گلی گئی ہے
اس کے اختتام پر محلہ جوہری باڑہ میں ان کی قبر ہے[۱]"

صاحب الاعلام اور النور السافر کے محشی نے آپ کا سن وفات ۱۰ محرم
۱۰۳۷ھ درج کیا ہے، جو صحیح نہیں ہے[۲]، قاضی زاہد الحسینی نے اپنی کتاب طبقات
المفسرین میں عبدالقادر کی وفات کے لیے ۱۰۳۱ھ درج کیا ہے، جو
کتابت کی فاحش غلطی ہے،

شاگرد: شاگردوں کی تعداد بہت ہے ان میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے،

شیخ بن عبداللہ بن شیخ: یہ شیخ عبدالقادر کے بھتیجے تھے، ۹۹۳ھ میں تریم میں پیدا ہوئے،
وطن میں اکابر سے کسب فیض کیا، اس کے بعد حرمین کا رخ کیا اور وہاں کے اکابر
واعیان سے استفادہ کیا، اور تقویٰ و طہارت میں بلند مقام کے حامل ہو گئے،
۱۰۲۵ھ میں ہندوستان آئے اور شیخ عبدالقادر کے دامن تربیت سے وابستہ ہو گئے،
ان سے خرقہ اور اجازت حاصل کرنے کے بعد دکن چلے گئے، وہاں وزیر اعظم عنبر نے ان
کا غیر معمولی اعزاز و اکرام کیا، برہان نظام شاہ بھی آپ کے فضل و کرم سے بہت متاثر
ہوا۔ اس پر درباری حاشیہ نشینوں نے کان بھرنا شروع کر دیئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا
کہ ان کو دکن سے کوچ کرنا پڑا، وہاں سے رخصت ہو کر ابراہیم عادل شاہ کی خدمت میں
بیجاپور چلے گئے، ابراہیم بڑی عزت و تکریم سے پیش آیا، یہاں ان سے ایک کرامت کا ظہور ہوا، جس سے سلطان
کا اعتقاد بہت بڑھ گیا، سلطان کے نچلے حصہ میں ایک پھوڑا نکل آیا تھا جس کی
وجہ سے وہ نقل و حرکت سے معذور ہو گیا تھا، اطبا علاج میں ناکام ہو چکے تھے،

---
۱ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے ص ۲۰۵ ۲ حاشیہ النور السافر ص ۴۴۳

سلطان شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا انھوں نے فرمایا پورے طور پر بیٹھو،
بیٹھتے ہی ساری تکلیف ختم ہو گئی، اس واقعہ سے سلطان ایسا متاثر ہوا کہ شیعہ
مذہب ترک کر کے سنی ہو گیا، سلطان کی وفات تک وہ یہیں رہے، اس کے
بعد دولت آباد منتقل ہو گئے، وہاں ملک عنبر کے لڑکے وزیر اعظم فتح خاں نے
اس اخلاق و احترام کا اظہار کیا کہ یہیں قیام فرما لیا، اور خلق خدا کی رہنمائی
کا فرض انجام دیتے رہے، آخر کار ۱۰۵۵ھ میں دولت آباد ہی میں جان جاں
آفریں کے سپرد کر دی، آپ صاحب تصنیف بزرگ تھے، ان کی ایک کتاب السلسلۃ
فی الخرقۃ الشریفۃ، بہت مقبول و مشہور ہوئی، (خلاصہ)

احمد بن محمد بن عبدالرحیم: یہ بھی اپنے عہد کے یگانہ روزگار فاضل تھے، فقہ شافعی پر
عبور رکھتے تھے، اس لئے فقیہ ان کے نام کا جزو ہو گیا، والد اور وطن کے دیگر اعیان
سے تحصیل علم کی، ۹۹۶ھ میں حرمین گئے، اور وہاں مشائخ حرمین سے استفادہ کیا،
پھر ہندوستان تشریف لائے اور شیخ عبدالقادر کی خدمت میں ربیع الاول
۹۹۷ھ سے جمادی الاولیٰ ۹۹۸ھ تک رہ کر فیضیاب ہوئے، اس کے بعد ہندوستان
کے دوسرے شہروں میں جانے کی اجازت مانگی، اور احمد آباد سے برہان پور آئے
وہاں سلطان علی عادل شاہ نے بڑی پذیرائی کی، مگر یہ حسن ظن زیادہ دنوں
قائم نہیں رہا، ملکی حفاظت اور اپنے ذاتی اقتدار کی خاطر علی عادل شاہ نے
حالت سفر میں لاہور کے قریب ان کو زہر دلوا دیا جس سے بدھ کی رات ۱۴ شوال
۱۰۰۰ھ میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، موصوف فہم و فراست، علم و فضل، جودت
طبع اور قوت حافظہ میں بے نظیر تھے، تفسیر، حدیث اور فقہ میں مہارت کے ساتھ

ادب، لغت، اور دواوین پر گہری نظر رکھتے تھے، ہزاروں اشعار نوک زبان تھے، اس کے علاوہ درس و تدریس اور افتاء کی اجازت سے بھی سرفراز تھے، ادبی لطائف کے تو بادشاہ تھے، ان کی وفات پر علماء نے بہت ماتم کیا اور شعراء نے دلدوز مرثیے لکھے صاحب النور السافر نے ان کی وفات پر پردرد مرثیہ لکھا تھا جسے لوگ پڑھ کر غم میں ڈوب جاتے تھے،

عفیف الدین عبداللہ بن فلاح الحضرمی | شیخ عبداللہ بھی شیخ عبدالقادر کی صحبت میں رہے، اور ان سے روحانی فیوض حاصل کئے، شیخ عبدالقادر خود کہتے ہیں کہ "میں جب ۹۹۹ھ میں احمد نگر گیا، تو عبداللہ نے میری خدمت میں رہ کر الفتوحات القدوسیہ فی الخرقۃ العیدروسیہ شروع سے آخر تک پڑھی"[۱] شیخ کے زیادہ حالات معلوم نہ ہوسکے،

سید شیخ بن عبدالقادر | یہ بھی اپنے وقت کے بڑے مشائخ میں تھے، النور السافر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالقادر کے ایک ہی صاحبزادے تھے، جو اپنے والد کے نقش قدم پر تھے، انھوں نے اپنے والد ہی سے کسب فیض کیا، ۹۹۸ھ میں ان کی ولادت بھروچ میں ہوئی، صاحب نزہۃ الخواطر نے احمد آباد مولد لکھا ہے، جو صحیح نہیں ہے[۲] اپنے والد سے اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے اور والد کی حیات تک ان کی خدمت میں رہے، اس کے بعد سورت میں فیض و افادہ کی خدمت انجام دی، اور سورت ہی میں مستقل قیام کرلیا، صاحب نزہۃ الخواطر نے الحدیقۃ الاحمدیہ کے حوالہ سے ان کی وفات جمادی الاولیٰ ۱۰۹۶ھ لکھی ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتی، النور السافر کے مطبوعہ نسخہ میں حاشیہ پر وفات ۱۰۵۰ھ لکھی ہے اور یہی صحیح ہے، آپ کا انتقال احمد آباد میں ہوا، اور قبر دادا کے پہلو میں ہے

شیخ عبدالقادر کہتے ہیں کہ "مجھے ان کی وفات پر سخت صدمہ ہوا، جب یاد آجاتی ہے، رنج و غم کا طوفان برپا ہوجاتا ہے، اور ان کا غم ہر دم تازہ رہتا ہے، میں نے ان کے حالات پر اپنی کتاب "صدق الوفا بحق الاخاء" میں لکھے ہیں"[۱]

محمد بن علوی بن محمد ابی بکر السقاف | یہ بھی اپنے وقت کے یگانۂ روزگار فاضل تھے، اپنے وطن کے علماء سے کسب فیض کے بعد ہندوستان آئے، اور شیخ عبدالقادر کے دامن فیض سے وابستہ ہوگئے، کچھ دن کے بعد شیخ نے ان کو شیخ عبداللہ بن علی کی خدمت میں بھیج دیا، چنانچہ وہ سط میں ان کی خدمت میں ایک عرصہ تک رہے، ۱۰۱۹ھ میں شیخ کے حکم سے فریضۂ حج ادا کیا، شیخ شلی کہتے ہیں کہ "وہ میرے محترم و باکمال استاد تھے، ان کی کرامات معروف و مشہور ہیں، آخر عمر میں وہ حرمین میں مقیم ہوگئے تھے، اس لئے نزیل حرمین ان کے نام کا جزو ہوگیا، مکہ مکرمہ ہی میں بعد نماز جمعہ ۱۰۱۱ھ میں اس دار فانی سے کوچ کیا، ان کے جنازہ میں خلقت کا اژدحام تھا، امیر مکہ نے بھی مشایعت کو اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ کی قبر مبارک کے پاس سپرد خاک کیے گئے"[۲]

الشیخ احمد بن علی المالکی بکری | یہ بھی ہندوستان کے مایہ ناز عالم اور بزرگ تھے، مورخ شلی کہتے ہیں کہ وہ کامل الصفات، بلند افکار اور صاحب ذوق لطیف تھے، روز حساب سے بہت ڈرتے تھے[۳] اپنے والد سے تحصیل علم کے بعد شیخ عبدالقادر اور دیگر مشائخ سے کسب فیض کیا،

صاحب النور السافر نے اپنے اس شاگرد کے بارہ میں لکھا ہے "شیخ احمد اپنے

۱؎ نزہۃ الخواطر ۵/۲۹ ۲؎ المشرع الروی بحوالہ خلاصۃ الاثر ۴/۲۲ ۳؎ ایضاً بحوالہ نزہۃ ۵/ ۵۸

علم و تقویٰ میں بہت ممتاز کتاب و سنت کے متبع سلف کے طریقہ پر گامزن قناعت پسند عفیف اور بلند کردار تھے وہ ہر لحظہ مشغول رہتے مطالعہ یا کتابت ان کا محبوب مشغلہ تھا وفات سے قبل بینائی سے محروم ہو گئے تھے، اہل علم نے ان کی شان میں بلند پایہ قصائد کہے[۱] ۲۲/ربیع الثانی ۱۰۰۹ھ میں احمد آباد میں وفات پائی[۲]

سید محمد بن عبداللہ الحضرمی یہ بھی اپنے وقت کے مشائخ میں تھے ۹۷۰ھ میں پیدا ہوئے اپنے وطن میں اپنے دادا اور دوسرے علما سے کسب فیض کیا اور حدیث و فقہ میں کمال کے ساتھ تصوف و سلوک میں بھی مدارج عالیہ کو پہونچے ان کے دادا شیخ بن عبداللہ احمد آباد میں تھے جب ان کے فضل و کمال کا حال معلوم ہوا تو ان کو احمد آباد بلا لیا انھوں نے بہت سے علوم دادا سے حاصل کیے عم محترم) شیخ عبدالقادر بھی ان کے علم و فضل سے متاثر تھے سید محمد نے ان سے بھی علوم کی تحصیل کی اور فضل و کمال کی اس منزل کو پہونچے جہاں دوسرے نہیں پہنچ پاتے ان سے اجازت و خلافت سے سرفراز ہو کر سورت میں رشد و ہدایت کی شمع روشن کیے رہے ۱۰۳۱ھ میں سورت ہی میں انتقال کیا[۳] ان کی قبر پر بعض تاجروں نے ایک بڑا قبہ بنوایا اور اس کے قریب ایک مسجد تعمیر کی اور ایک کنواں بھی اسی کے قریب کھدوایا پھر اس پر ایک بڑی جائداد وقف کی گئی ان کی قبر زیارت گاہ خلائق ہے[۴]

---

[۱] النور السافر و نزہۃ ۵/۱۵ [۲] النور السافر و نزہۃ الخواطر ۵/۹

[۳] خلاصہ

[۴] نزہۃ

اقبال کی معنویت آج

از

مرزا سعید الظفر چغتائی ریڈر فزکس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اقبال اور اقبالیات پر دنیا کی مختلف زبانوں خصوصاً اردو میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس پر اضافہ کرنے کے لیے غیر معمولی محنت بھی درکار ہے اور غیر معمولی ذہنی صلاحیت بھی جو تلاش و جستجو کو تحقیق کی منزل تک پہونچا دے اس لیے اس راہ میں قدم اٹھانے کی ہمت نہیں پڑتی اگر اہل علم کا اصرار ہے کہ میں بھی اس موضوع پر لب کشائی کروں مجھے نہ کسی گہری بصیرت کا دعویٰ ہے نہ وسعت علم و نظر کا ادعا پھر بھی علم و ادب کی اس محفل میں شرکت کی جسارت کر رہا ہوں کہ شاید یوسف کے خریداروں میں میرا نام بھی لکھ لیا جائے اور اقبال کے بے شمار مداحوں کی فہرست میں اس کج بیان کا اندراج بھی ہو جائے

صاحبان فکر و نظر سے اس آشفتہ بیانی پر معذرت خواہ ہوں

والعفو عند کرام الناس مامول

اقبال کی شخصیت اور فن کے یوں تو بہت سے پہلو ہیں لیکن وہ درحقیقت شاعر ہیں اور ان کی شاعری ان کی عظمت فکر اور بلندی خیال کی ترجمان ہے ان کی شاعری صرف ذاتی زندگی کے تاثرات اور واردات کی عکاس نہیں بلکہ حالات حاضرہ

اور عصرِ نو کے احساسات کی آئینہ دار ہے، بیرونی دنیا کے ان مشاہدات سے اقبال
کو اتنا قریبی تعلق تھا کہ شاید اس کے ذکر کی متحمل نہ ہو سکی اس لیے قلب و نظر کی گہرائیوں
سے ہم آہنگ ہو کر ان کی شاعری نے بین الاقوامی رنگ اختیار کیا۔

شاعری کے بڑے عناصر تین ہوتے ہیں، کسبِ فن، ذہنی مشاہدہ اور جذبۂ
اندروں، یہ سچ ہے کہ شعر یا نثر لکھنے کے بعد تراش و خراش کی ضرورت پڑا
کرتی ہے کلام میں آب و تاب پیدا کرنے کی کوئی حد نہیں ہے لیکن شاعری کے
آغاز سے پہلے تحصیلِ فن اور مشقِ سخن ناگزیر ہے، اگر عروض سے واقفیت
اور زبان پر عبور نہیں ہے تو جذبہ کی کوئی گہرائی، مشاہدہ کی کوئی وسعت
اور حک و اصلاح کی کوئی کوشش حرف و سنگ کو درِ شاہوار اور لعلِ شب
چراغ نہیں بنا سکتی ہے، کسبی باتوں میں فنِ شعر گوئی کے علاوہ وسعتِ نظر، کثرتِ
مطالعہ، فکر کی گہرائی اور قوتِ مشاہدہ بھی ناگزیر ہے ۔۔ اقبال کو یہ سبھی باتیں
حاصل تھیں، ان کی شاعرانہ عظمت اس بات کی شاہد ہے

مشاہدہ اور جذبہ کے معاملہ میں طبعی مناسبت اور صاحبِ فن کی شخصیت
کو بڑا دخل ہوتا ہے، الذت و الم کا شدید احساس بہتوں کو ہوتا ہے لیکن اس احساس
کا اظہار ہر شخص کی اپنی ذہنی صلاحیت پر منحصر ہے، اس میں ایک حد تک وہ سماجی اور
ثقافتی تربیت بھی کارفرما ہوتی ہے، جو پیدائش سے ہوش کی آنکھیں کھولنے تک اور
اس کے بعد واقعہ کے پیش آنے تک میسر آتی ہے، اس میں وہ زمانی و مکانی فضا
بھی دخل انداز ہوتی ہے، جس میں کوئی فرد دورانِ واقعہ سانس لے رہا ہو، ہو سکتا ہے
کہ معجزۂ فن کی نمود کے لیے کوئی مخصوص جین Gema وجود میں آ جاتا ہو لیکن اس کا

ہمیں علم نہیں ہو شاعری کی حد تک کمالِ فن کبھی میراث نہیں رہا ورنہ نظامی اپنے
لختِ جگر سے نہ کہتے ؎

در شعر مپیچ و در فنِ او ...

در شعر مجو بلند نامی
کیں ختم شد است بر نظامی

آزادی کے بعد سے ہمارے یہاں کوئی بڑا شاعر غالباً اس لیے پیدا نہیں ہوا
کہ نہ ہمیں اب تربیتِ شعر گوئی میسر ہے اور نہ وہ جیتا جاگتا احساس جو سکوتِ لالہ و گل
سے بھی کلام پیدا کر لیتا ہے، اور ہنگامہ رستا خیز سے بھی، ہمارا ضمیر کچل گیا ہے، اور
ہم آسودگی کی نیند سو رہے ہیں، صرف کبھی کبھی خواب میں بڑبڑا اٹھتے ہیں،

ذہن کی کنہ صدمات سے زیادہ کسی اور چیز سے نہیں ہوتی، ہمیں کوئی شخص
یا چیز بہت عزیز ہو اور وہ ہم سے دفعتاً چھن جائے، کوئی تصور حرزِ جان ہو اور
دفعتاً اس کی شکست و ریخت سامنے آ جائے تو وجود میں زلزلہ آ جاتا ہے، اور
ذہن کے پرخچے اڑ جاتے ہیں، اسی طرح ہم کسی محبوب ذات یا تصور کی طرف سے مایوس
ہو چکے ہوں، اور وہ یک بارگی ہمیں مل جائے تو ایسی بے پایاں مسرت حاصل ہوتی ہے
کہ خطرہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں یہ شادیِ غم سے نہ بدل جائے، یہ کیفیاتِ زندگی اور
اس کے مظاہر کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے میں بھی معاون ہوتی ہیں،
توہمات اور تعصبات کی اصلاح میں بھی سودمند ہوتی ہیں، اور اگر دل فطرت
شناس ہو تو عظیم شعری نمود کا بھی سرچشمہ بنتے ہیں، لیکن اگر ذہن ناصاف ہو یا
کسی بات سے پورا لگاؤ نہ ہو تو چاہے قیامت ہی کیوں نہ سر سے گزر جائے کوئی
اثر نہ ہوگا، تعجب ہوتا ہے کہ تقسیمِ ملک اور اس کے ہولناک واقعات پر کوئی عظیم
شاعری وجود میں نہ آئی۔

اقبال زندگی بھر ذاتی اور قومی صدمات سے دوچار رہے ان سے ان کے متخیّل
وخیال ذہن کا ارتقا ہوتا رہا، ہم اقبال کے شعری ملکہ سے بھی متاثر ہوتے ہیں اور
ان کے تاثرات کی بوقلمونی سے بھی لیکن سب سے زیادہ ان کے فکر کی ارتقائی حرکیت
ہمارے اوپر اثر انداز ہوتی ہے شاعری ہو یا کچھ اور فن کا اندازہ اس کے
تاثرات کی گہرائی اور گیرائی Range and depth سے ہوتا ہے گہرائی
شدتِ خلوص سے آتی ہے اور گیرائی وسعتِ نظر سے محض فنی مہارت الفاظ کی تراش
وخراش محاوروں کے استعمال اور لفظوں کے دروبست سے شعر میں اثر نہیں
پیدا ہوتا ہے اثر انگیزی کے لیے دل پرسوز اور چشم گہربار کی ضرورت ہوتی
ہے جس کا دل راتوں کے گداز اور دنوں کی تپش سے خالی ہے اس کے کلام میں
انقلاب آخریں تاثیر تلاش کرنی فضول ہے صرف وقتی محرکات اور مقامی تاثرات
سے کلام میں آفاقیت نہیں پیدا ہوتی ہے، یہ سچ ہے کہ اپنی تہذیبی روایات اپنے علاقائی
ماحول اور وقتی مسائل سے صرف نظر ممکن نہیں ہے لیکن صاحب فن کی فنکاری ان باتوں
کو اتنی وسعت، عمومیت اور جامعیت بخشتی ہے کہ دور و دراز کے لوگ بھی سنتے ہیں تو
کہہ اٹھتے ہیں یہ تو میرے دل میں تھا، بسا اوقات صراحت سے زیادہ اشارت لطف
دے جاتی ہے اسی وجہ سے سرِ دلبراں کو حدیثِ دیگراں کے پیرایہ میں پیش کرنے
کو کمال فن سمجھا جاتا رہا ہے کہا جاتا ہے کہ عظمتِ فن کی ایک بڑی کسوٹی وقت ہے، حافظ
کو چھ سو برس گذر گئے لیکن آج بھی اس کے اشعار میں ہمیں شادابی و تازگی ملتی ہے
اقبال کا دور ابھی دور نہیں ہوا ہے لیکن اس کے کلام کو جو جہاں گیری نصیب ہوئی وہ
شاید ہی کسی اور کو میسر ہوئی ہو، وقت کے ساتھ مشرق و مغرب دونوں اس سے یکساں

متاثر ہیں اور وادی و کہسار سب اس کے نغموں سے گونج رہے ہیں'

ممکن ہے اہل زبان ان کے بعض الفاظ اور محاوروں پر معترض ہوں لیکن
اس کے باوجود انھوں نے اپنے افکار و خیالات کے اظہار کے لئے جو پیرایہ بیان
اختیار کیا ہے اور معانی کو دل میں اتارنے کے لئے جیسے مناسب اور پراثر الفاظ استعمال
کیے ہیں ان کے لئے ایک عالم صدائے تحسین بلند کر رہا ہے انھوں نے نہ صرف نئے
مضامین ایجاد کیے بلکہ ان کی ادائیگی کے لئے ان کے شایان شان ایک مجتہدانہ طرز
بیان بھی ایجاد کیا، ان کے خیالات وافکار میں ارتقا کے ساتھ ساتھ زبان میں
بھی ارتقاء ہوتا رہا، بانگ درا کی خطابت بعد میں شعریت میں گھل گئی اور اگر
کہیں ملتی ہے تو ڈرامائی انداز سے، جیسے ابلیس کی مجلس شوریٰ میں۔

یوں تو نئی ترکیبیں ہر قابل ذکر شاعر استعمال کرتا ہے لیکن اقبال نے لاجواب
تشبیہیں اور ماورائی استعارے پیش کیے ہیں۔ مثلاً

وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح　　یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیل
اور وہ پانی کے چشمے پر مقام کارواں　　اہل ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل
(خضر راہ)

ہے تہِ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر　　قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں
وادیِ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب　　لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
(مسجد قرطبہ)

تیرے بھی صنم خانے میرے بھی صنم خانے　　دونوں کے صنم خاکی دونوں کے صنم فانی
(بال جبریل)

اس سے بڑھ کر اعجازِ بیان اور کیا ہوگا،

چند ادب پارے اور ملاحظہ ہوں، دیکھیے الفاظ کی سحر طرازی کس طرح خیالات کو دل نشین کر رہی ہے،

آدمی کے ریشہ ریشہ میں سما جاتا ہے عشق — شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحرگاہی کا نم

عروسِ لالہ مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب — کہ میں نسیمِ سحر کے سوا کچھ اور نہیں

(بالِ جبریل)

سخن تازہ زدم کس بہ سخن وا نہ رسید — جلوہ خوں گشت و نگاہے بہ تماشا نہ رسید

زشاعر نالۂ مستانہ در محشر چہ می خواہی — تو خود ہنگامۂ ہنگامۂ دیگر چہ می خواہی

(زبورِ عجم)

نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں — کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی (ضربِ کلیم)

لیکن اقبال کی شخصیت دراصل ان اشعار کی رہینِ منت ہے، جن میں فکر جذبہ بن کر سامنے آئی ہے، جن میں حالاتِ حاضرہ اور عصری حسیت ہے، جن میں غمِ دوراں اسی خلوص و ولولہ کے ساتھ سامنے آیا ہے، جو ہماری شاعری میں غمِ جاناں کے لئے مخصوص رہا ہے، عصری آگہی کے ساتھ اسی خلوص کے باعث اقبال کی غزلوں تک میں فکری احساس تخییل کا ہم دوش ہو گیا ہے، مثالیں بالِ جبریل میں بھی بکثرت مل جائیں گی، پیامِ مشرق میں بھی اور زبورِ عجم میں بھی، خود ضربِ کلیم میں مضامین کا تنوع دیکھئے اور شعریت ملاحظہ فرمائیے، اختصار کے خیال سے نظموں کی نمائندگی اشعار سے کر رہا ہوں،

ہجومِ مدرسہ بھی سازگار ہے اس کو — جنوں کے واسطے لازم نہیں ویرانہ

شعلہ سے ٹوٹ کر مثلِ شررِ آوارہ نہ رہ — کر کسی سینۂ پرسوز میں خلوت کی تلاش

ابھی تک ہے پردہ میں اولادِ آدم — کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے،

چاہیئے خانۂ دل کی کوئی منزل خالی — شاید آجائے کہیں سے کوئی مہمان عزیز

فنِ محض سے ہٹ کر فکری فن کی طرف آئیے تو کہنے کی پہلی بات یہ ہے کہ اقبال کا متحرک و فعال ذہن ہمیشہ سوچتا رہا ہے اور نئے مشاہدات کی روشنی میں نئے نتائج برآمد کرتا رہا ہے، یہی آفاقی سائنسی طرزِ عمل ہے، وہ صرف سوال اٹھانے پر کبھی قانع نہ ہو لئے بلکہ انھوں نے ہمیشہ جواب بھی تلاش کیے ہیں، اور علم و دانش اور تہذیب و معاشرت کی گتھیوں کو برابر سلجھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں، وہ بنیادی سوال جو گوتم بدھ کے زمانہ سے آج تک انسانی ذہن میں گونج رہا ہے، اقبال کے ذہن میں بھی ہمیشہ گونجتا رہا، انسان آخر مبتلائے آلام کیوں ہے، وہ ہندی مسلمانوں کی زبوں حالی سے بے حد متاثر ہیں، اور انھیں تاریخ کے گذشتہ اوراق کی جھلک دکھا کر پھر عہدِ رسالت و دورِ صحابہ کو شمعِ راہ بنانے کا مشورہ دیتے ہیں، اور جوابِ شکوہ میں خدا کی زبان سے اعلان کرتے ہیں،

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں — یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

وہ تقدیر کے سایہ میں پناہ لینے والوں اور اپنی کوتاہی و بے عملی کے لیے قسمت کو بدنام کرنے والوں سے کہتے ہیں،

تو کیوں ہے تابعِ تقدیرِ یزداں؟ — تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

اور انھیں مشورہ دیتے ہیں کہ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبال قوم کو سعیِ پیہم اور جہدِ مسلسل کی دعوت دیتے ہیں، کاش ہمارے نوجوان

اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ

ع زندگی جہد است و استحقاق نیست

آیئے اب سود و سودا اور مکر و فن کے بازار سے ہٹ کر ذرا عقل و عشق کی بحث اقبال کی زبان سے سنیں،

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا عشق تمام مصطفےٰ عقل تمام بولہب،

عملی زندگی میں طرزِ عمل دو ہی ہیں، ایک یہ کہ وہ بات کہو جس سے سب لوگ خوش ہوں، وہ کام کرو جس سے ذاتی نفع وابستہ ہو اور اس طرح سوچو کہ قول و عمل کا تضاد چھپا رہے، یہ ہنر بڑا مشکل ہے لیکن جب تک بن پڑتا رہے اہل دنیا کے بڑے کام آتا ہے،

اقبال جب عقل بولہبی کی جگہ جگہ مذمت کرتے ہیں، وہ یہی ابن الوقتی ہے، دوسری طرف حق و صداقت کی کڑی منزل ہے، جہاں دل و زبان کی ہم آہنگی، قول و عمل کی مطابقت اور ظاہر و باطن کی یکسانی ضروری ہے، لوگ بچوں سے کہتے ہیں سچ بولو، لیکن وہ کبھی محسوس نہیں کرتے کہ یہ کام کتنا مشکل ہے، انسان جب کسی ضابطۂ اخلاق کا پابند ہو، اس کے مطابق ہر برائی سے بچتا ہوا اور ہر فرض ادا کرتا ہو، تب راستباز اور صداقت شعار کہلاتا ہے، اقبال کا عشق یہی ہے، جو عقل کا منتہائے کمال ہے، بے عقلی یا بد عقلی نہیں ہے، جس سے توہم پرستیوں کا جواز نکلتا ہے، آج ہم عقل کی دنیا میں بجا طور پر رہ رہے ہیں، لیکن کاش اس دنیا میں چند نفر عشق کے تقاضوں پر پورے اترے ہوئے مل جائے، عشق اور وجدان کا قریبی تعلق ہے اور وجدان کا ذکر ادبیاتِ عالیہ

خصوصاً اقبالیات میں برابر آتا رہتا ہے، نامناسب نہ ہوگا اگر چند جملوں میں اس کی توضیح کر دی جائے، عقلی استدلال، استقرائی یا ریاضیاتی ایک شعوری عمل ہے جسے انسان چند مقررہ اصولوں کے مطابق اختیار کرتا ہے، لیکن جب کوئی جذبہ یا فکر انسان کے ذہن پر طاری ہو جاتا ہے تو دماغ سوتے جاگتے اسی کی دھن میں لگ جاتا ہے، اور لاشعور میں مسئلہ کو حل کر لیتا ہے، اسی کو وجدان کہتے ہیں، وجدانی نتیجے کمپیوٹری رفتار سے چشم زدن میں برآمد ہوتے معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے پیچھے مدتوں کی لگن اور تڑپ ہوتی ہے، جسے لوگ فراموش کر جاتے ہیں،

عشق و عقل سے بات فوراً سخت کوشی تک پہنچ جاتی ہے، جس سے اقبال کے مطابق زہرِ زندگانی انگبین بن جاتا ہے، آج کی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ محنت کا پھل کم اور ہنرمندی کا زیادہ ملتا ہے، پس ماندہ ملکوں کا مزدور جتنی محنت کرکے قوت لایموت کماتا ہے، ترقی یافتہ ملکوں میں اس کا دسواں بیسواں حصہ بھی کام کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی اور سیم و زر کی بارش ہوتی رہتی ہے، لیکن ہنرمندی کے لیے سلیقہ بھی درکار ہے، عقل کی کارفرمائی اور سلیقہ کی کیمیاگری ملیچھ کو لاکھ بنا سکتی ہے، عقل راہ دکھاتی ہے اور عشق بے خطر آگے قدم بڑھاتا ہے، دماغ کے ساتھ پامردی بھی ضروری ہے، اگر عقل نے سمتِ سفر متعین نہیں کی تو تگاپوئے پیہم سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، بلکہ منزل دور سے دور تر ہوتی چلی جائے گی، رخ اگر ترکستان کی طرف ہے تو کعبہ تک رسائی کیونکر ممکن ہے، اقبال کے افکار میں خودی اور بے خودی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے،

انفرادی صلاحیتوں کو کھلے بغیر ترقی کے اعلیٰ مدارج تک پہونچانا اثبات خودی ہے، اس منزل پر پہنچ کر افراد کی خودی باہمی تعاون سے ایک وسیع تر جماعتی خودی کو جنم دیتی ہے، جو اگلے مراحل طے کراتی ہے اور منتہائے کمال کو پہنچ کر وسیع تر جماعت اور وسیع تر خودی کو وجود میں لاتی ہے، اس طرح انسانی معاشرہ کی ساخت مضبوط اور وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہے، نفی خودی کے بغیر بے خودی کے ذریعہ افراد سے خاندان، خاندانوں سے شہر، شہروں سے ملک اور ملکوں سے انسانی برادری بنی اور بن رہی ہے، ہر پھول کا رنگ و بو سلامت ہے، لیکن ان کی حتمی غایت چمنستانوں کی تعمیر ہے،

یہ اصول سیاسیات، لسانیات، سماج اور مذہب سب پر عاید ہوتا ہے، محدودیت سے وسعت کی طرف ہمارا سفر جاری ہے، مگر یہ عمل پائدار اسی وقت ہوتا ہے کہ نفی خودی نہیں بے خودی پیش آئے، نپولین اور ہٹلر کی کوششیں ناکام رہیں، کیوں کہ وہ دوسروں کی تہذیبوں کو کچل رہے تھے، آج مفکرین ایشیا، یورپ، افریقہ اور امریکہ میں اتحاد کی کوشش کر رہے ہیں، اور بین الاقوامی ادارے کو پروان چڑھانے کی فکر ہے، لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے، جب کہ چھوٹی وحدتوں کی خودی توڑی نہیں بلکہ جوڑی جائے، اور ان کی انفرادیت کے تحفظ کے ساتھ ایسی اجتماعیت کی طرح ڈالی جائے جو سب کی سلامتی کی ضامن ہو، ہمارے برصغیر کے لیے ان تصورات میں تعمیر مستقبل کے لیے اشارے ہیں،

اقبال ایک باغی ذہن کے مالک تھے، کسی عمل کا مستحکم وجود بغاوت کے بغیر ممکن نہیں، نقل را چہ عقل! انھوں نے فکر مدرسہ و خانقاہ کو آزاد کرانے

کی کوشش کی، تقدیر کو بہانہ بنانے والوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، ستارہ شناسی کا طلسم توڑا، جذبۂ عمل اور جذبۂ انقلاب کو سراہا، وہ جب اور جہاں کہیں بھی انھیں نظر آیا، عالم بیداری میں ہو، یا عالم خواب میں، اس کے بے سرگرم عمل رہے

ع زشہر ستارہ جو یم، زستارہ آفتابے،

یہ طرز عمل، یہ تلاش، یہ راہ سلوک ان کا سب سے بڑا اسوہ ہے، یہی ان کی سب سے بڑی عصری معنویت ہے، وہ جہاں تک پہونچے وہ ہماری آخری منزل نہیں ہے، ہمیں سفر اس کے آگے جاری رکھنا ہے،

گذر جا عقل کے آگے کہ یہ نور چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے،

(حدیث شریف ہے ...)

انسان کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ بے معنی شئے کو ترک کر کے اس کی جگہ بامعنی چیز اختیار کرتا رہے،

عالم انسانیت کو ابدی پیام دینے والے کی شایان شان وسعت کے ساتھ ہمیں اس حدیث کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا چاہئے،

اقبال کامل

عریش کی بازیابی

از

عبدالسلام قدوائی ندوی

پہلی جنگ عظیم میں جب جرمنوں کو شکست ہوئی تو اس کا اثر ترکوں پر بہت بڑا پڑا جنگ میں وہ جرمنی کے ساتھ تھے، اس لئے برطانیہ، امریکہ، فرانس اور اٹلی وغیرہ کو ترکوں کے خلاف کارروائی کا موقع مل گیا، ان لوگوں کی دیرینہ آرزو تھی کہ ترکوں کی طاقت ختم ہو جائے، اور خلافت عثمانیہ پارہ پارہ ہو جائے، انھوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے انیسویں صدی میں بے شمار منصوبے بنائے، طرح طرح کی سازشیں کیں، کبھی زار روس کی فوجیں حملہ آور ہوتی تھیں کبھی برطانوی لشکر آگے بڑھتا تھا، کبھی فرانس اور اٹلی کی طرف سے خلافت عثمانیہ پر حملے ہوتے تھے، آج قفقاز زیر یلغار ہے کل ٹیونس زد میں ہے کبھی الجزائر تاراج ہو رہا ہے، کبھی بلقان کی ریاستوں کو بغاوت پر آمادہ کیا جا رہا ہے امیر شکیب ارسلان مرحوم نے اپنی مشہور کتاب حاضر العالم الاسلامی کے حواشی میں ان سازشوں اور حملوں کی تفصیل بیان کی ہے،

پہلی جنگ عظیم کے بعد ان لوگوں کو موقع مل گیا، جنگ کے دوران عربوں کو آزادی و خود مختاری کا خواب دکھایا گیا، خلافت عثمانیہ کے حجازی گورنر

شریف حسین اور ان کے لڑکوں فیصل اور عبداللہ کو پورے طور پر بغاوت کے لیے آمادہ کر لیا گیا، خلافت عثمانیہ کے وزیر اعظم انور پاشا خود حجاز گئے تاکہ شریف حسین کو اس سے باز رکھیں لیکن ان کے سامنے شریف نے خلافت سے پوری وفاداری کا اظہار کیا، چشم دید راویوں کا بیان ہے کہ خانۂ کعبہ کے اندر جاکر انور پاشا کے سامنے شریف نے قسم کھا کر یقین دلایا کہ میں کسی سازش میں شریک نہیں ہوں اور نہ ترکی حکومت کا پوری طرح سے وفادار ہوں، لیکن انور پاشا کے جاتے ہی برطانوی حکومت کے اشارہ اور مدد سے بغاوت کا اعلان کر دیا چند ہزار ترک سپاہی کیا کر سکتے تھے، بکثرت شہید ہوئے، حرم میں بھی ان غریبوں کو پناہ نہیں مل سکی،

شریف حسین کے ساتھ ان کے بیٹوں نے بھی عراق، شام، لبنان اور فلسطین میں علم بغاوت بلند کر دیا اور برطانوی فوجوں کی مدد سے ان علاقوں سے ترکوں کو بے دخل کر دیا، جب لارڈ ایلنبائی کی سرکردگی میں فیصل بن حسین بیت المقدس میں فاتحانہ داخل ہوئے تو برطانوی جنرل نے کہا کہ آج صلیب کو ہلال پر مکمل فتح ہوئی، بیت المقدس مسیحی اقتدار کے ماتحت آگیا، یہ صلیبی جنگ ہم نے اس طرح فتح کی کہ ہماری فوج کا رہبر اور معین کار فرزند رسول ہے، یہ شریف حسین اور ان کی اولاد کی سیادت کی طرف اشارہ تھا، یہ لوگ ہاشمی تھے، اور اپنے کو آل رسول کہتے تھے، ان واقعات سے سارا عالم اسلام بے چین ہو گیا تھا، اور ان اسلامی علاقوں اور مقدس مقامات کی بازیابی کے لیے، مسلمانوں نے جان کی بازی لگا دی، ہندوستانی مسلمان سب سے پیش پیش تھے،

مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام اور دوسرے رہنماؤں نے اس راہ میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، شریف حسین کی اس حرکت ناروا سے متاثر ہو کر ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کہا تھا،

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ — خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز

عیسائی حکومتیں صرف اس پر قانع نہ تھیں کہ عرب و افریقہ سے ترکوں کا اقتدار ختم ہو جائے بلکہ ان کی آرزو تھی کہ ایشیائے کوچک اور قسطنطنیہ سے بھی وہ بے دخل ہو جائیں، اور دنیا سے دولت عثمانیہ کا نام و نشان مٹ جائے، اس کے لئے ایک طرف انھوں نے خلیفہ کو مجبور کر کے قسطنطنیہ پر اپنا اقتدار قائم کر لیا اور دوسری طرف یونان کو شہ دے کر ایشیائے کوچک پر حملہ کرا دیا۔ یونانی فوجوں نے خون کے دریا بہا دیئے، سمرنا اور دوسرے شہروں پر ان کا قبضہ ہو گیا، اور قریب تھا کہ دولت عثمانیہ کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ جائے اقبال سہیل نے اس خون ریزی سے متاثر ہو کر کہا تھا،

کہیں دلشگر یونان کی بزم رقص برپا ہے — کہیں خونیں تماشا ہو رہا ہے جنگ بلقان کا

مسلمان علامہ شبلی کے الفاظ میں یقین رکھتے تھے کہ

ع زوال دولت عثماں زوال شرع و ملت ہے

اسی لیے فرزند و عیال و خانماں کی فکر سے بے نیاز ہو کر ان صلیبی حملہ آوروں کی پامالی کے لیے دل و جان سے کوشاں تھے، اللہ نے ترکوں کو ہمت دی اور انھوں نے یونانیوں کو ذلت بخش شکست دے کر یورپی حکومتوں کو مجبور کر دیا کہ ان کے وجود کو تسلیم کریں جب کچھ عرصہ کے بعد ترکوں نے یونانی فوجوں کو شکست دے کر

سمرنا پر پھر قبضہ کیا تو سہیل مرحوم نے بڑی پر زور نظم لکھی، جو معارف کے تقریباً دو صفحوں میں شائع ہوئی تھی، انھوں نے بڑی مسرت سے کہا تھا،

زمانہ نے ورق الٹا ہے پھر تاریخ ماضی کا — وہ پھونچا پرچم اسلام پھر ارض سمرنا میں

مجاہدین کی جانبازی اور شوق شہادت سے متاثر ہو کر انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ

کفن سادہ پہننا ننگ ہے رنگیں مزاجوں کو
ہم اپنے داغہائے خوں سے گل بوٹے بنا دیں گے

ساری دنیائے اسلام میں فتح سمرنا کی خوشی منائی گئی، میں اس زمانہ میں ندوہ میں پڑھتا تھا، وہاں کی مسرت و شادمانی کا نقشہ آج بھی آنکھوں میں پھر رہا ہے فتح سمرنا کی خوشی میں ایک دن کی چھٹی ہوئی، اور جشن منایا گیا،

سمرنا تھوڑے ہی عرصہ یونانیوں کے قبضہ میں رہا تھا مگر فلسطین سالہا سال سے یہودیوں کے قبضہ میں ہے اور بارہ برس سے بیت المقدس پر بھی ان کی حکومت قائم ہے، لیکن مسلمانوں میں پرانے جوش و خروش کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتا ہے، عام مسلمانوں کا کیا ذکر ہے عرب حکمرانوں کو بھی کوئی خاص فکر نہیں ہے اور دشمن سے نبرد آزمائی کے بجائے آپس میں دست بگریباں ہیں،

عریش | یہی وجہ ہے کہ عریش جیسے اہم شہر کی بازیابی جو مصر کا مدخل و مفتاح ہے لائق اعتناء نہیں سمجھی گئی، اور صرف اس کے ان ستم رسیدہ باشندوں کے سوا جنھوں نے بارہ سال یہودیوں کے مظالم برداشت کیے تھے اور کسی کی زبان سے مسرت کا ایک کلمہ بھی نہیں نکلا،

پرانی تاریخ عریش ہزاروں برس کا پرانا شہر ہے، قدیم زمانہ میں اسے رہنوکروورا کہتے تھے، پھر حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد یہ لارِیس کہلانے لگا، ابتدائی عیسوی صدی میں اسی نام سے اس کا ذکر ملتا ہے، قدیم اسرائیلی روایتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ فراعنہ کے دور میں یہ مصر کی سرحدی حفاظت گاہ تھی، کہا جاتا ہے کہ حضرت یوسف کے زمانہ میں ان کے والد اور بھائی اسی راہ سے مصر پہونچے تھے، حضرت یوسف نے یہیں انھیں خوش آمدید کہی تھی، لیکن مستند تاریخ ماٰخذ سے اس کی تصدیق اب تک نہیں ہو سکی ہے، رومیوں کے عہد میں یہ مصر میں شامل تھا اور قیصر کے گورنر مقوقس کی یہاں حکمرانی تھی،

اسلامی فتح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب شام اور فلسطین کی فتح مکمل ہو چکی تو مصر کی طرف بڑھنے کا خیال ہوا اور حضرت عمرو ابن العاص کی سرکردگی میں اسلامی فوجیں عریش کی طرف بڑھیں، یہ ریگستانی علاقہ میں اچھا سرسبز وشاداب نخلستان تھا، جہاں پھل اور پانی بافراط تھا، اس لیے قافلوں کی گذرگاہ اور سوداگروں کا مرکز تھا،

کثرت فتوحات کی وجہ سے مسلمانوں کی دھاک ایسی بیٹھی ہوئی تھی کہ عریش بلا مقابلہ مل گیا، اس کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں پورا مصر خلافت اسلامیہ کے زیر نگیں ہو گیا، رومیوں نے بعد کو وقتاً فوقتاً حملے کئے مگر مصر اسلامی حکومت کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکا، صلیبی جنگوں اور تاتاری حملوں کے زمانہ میں بھی مصر محفوظ رہا بلکہ ایک موقع پر مصری فوجوں نے تاتاریوں کو ایسی شکست دی کہ ان کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے،

نپولین کا حملہ نپولین نے جب مصر پر حملہ کیا تو ۱۷۹۹ء میں عریش بھی فرانس کے قبضہ میں چلا گیا لیکن ایک سال کے اندر ہی ایک معاہدہ کے مطابق عریش کو فرانسیسیوں نے خالی کر دیا، پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں جب انگریزوں اور فرانسیسیوں نے دولت عثمانیہ کے حصے بخرے کر دیئے اس وقت بھی عریش محفوظ رہا، اعلان بالفور کے بعد جب فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم ہوئی تب بھی عریش ان کی زد سے باہر رہا، گو کئی بار عرب حکومتوں سے جنگ ہوئی مگر عریش محفوظ رہا

عریش کا سقوط ۱۹۶۷ء میں جب جمال عبد الناصر کے عہد میں یہودیوں سے پھر جنگ ہوئی، تو عربوں کو بری طرح شکست ہوئی، بیت المقدس یہودیوں کے قبضہ میں چلا گیا، اور اس کے ساتھ بڑا وسیع عرب علاقہ ہاتھ سے نکل گیا، اس وقت جزیرہ نما سینا کے ساتھ عریش بھی یہودی سلطنت میں شامل ہو گیا،

بازیابی اس کے بعد سے برابر اس کی بازیابی کی کوشش ہوتی رہی مگر کامیابی نہ ہو سکی، بالآخر عین مایوسی کے عالم میں اللہ نے ایسی صورت پیدا کی کہ ابھی حال میں بارہ سال کے بعد یہودیوں نے خالی کر کے مصر کے حوالہ کر دیا، اور اسرائیلی جھنڈا اتر کر مصری پرچم لہرانے لگا، آج اقبال سہیل ہوتے تو فتح سینا کی کوئی نظم کہتے، تحریک خلافت کی طرح کی کوئی اسلامی تنظیم ہوتی، تو جوش و خروش کے ساتھ عریش کی بازیابی کا استقبال ہوتا، لیکن اس وقت مسلمان منتشر، احساس اسلامی مفقود اور اتحاد باہمی غائب ہے، نفسا نفسی کی اس فضا میں جوش و مسرت کہاں سے ہو، آج کل ملت کے مفاد کے بجائے ذاتی فوائد پیش نظر ہیں اور اعلاء کلمۃ الٰہی کے بجائے اپنی سربلندی کی آرزو ہے،

تلخیص وتبصرہ

ارجنٹائنا میں اسلام کی رفتار

ارجنٹائن جنوبی امریکہ کا ایک سرسبز وشاداب ملک ہے اسکا رقبہ [illegible] مربع کیلومیٹر اور آبادی ۱۹۶۰ء کی مردم شماری کے مطابق دو کروڑ ستر لاکھ کے قریب ہے، دار السلطنت بیونس آئرس کے علاوہ کارڈوبا (قرطبہ) لاپلاٹا اور منڈوزا وغیرہ مشہور شہر ہیں، سرکاری زبان اسپینی ہے،

اسلام کی آواز یہاں کئی سو برس پہلے پہونچ چکی تھی، اندلس میں مسلمانوں کے زوال کے بعد جب عیسائیوں کا تشدد حد سے گذر گیا تو مسلمان ادھر ادھر بھاگنے لگے، اس سلسلہ میں سنہ [illegible]ء میں مسلمان یہاں بھی آئے لیکن اس ملک پر بھی اسپینی عیسائیوں کی حکومت تھی، اس لیے مسلمانوں کو یہاں بھی اپنے دین ومذہب اور تہذیب ومعاشرت کے ساتھ رہنا دشوار ہو گیا، لیکن ان کا اثر کچھ نہ کچھ آج تک باقی ہے، پھر ۱۸۶۰ء میں جب لبنان میں دروزیوں اور مسلمانوں میں لڑائی ہوئی تو بہت سے مسلمان بھاگ کر ارجنٹائن آگئے، اسی طرح بلقان وغیرہ میں ترکی حکومت کے خاتمہ کے بعد مسلمانوں کی ایک جماعت آئی، اور جنگ عظیم کے بعد شام ولبنان وغیرہ پر سامراجی حکومت کے بعد بہت سے مسلمان یہاں آگئے، اس وقت مسلمان تقریباً ...... ہیں جن میں سے تقریباً ...... مسلمان پایہ تخت بیونس آئرس میں رہتے ہیں، کل آبادی

میں مسلمانوں کا اوسط ۵ فی صد ہے، لیکن ابھی تک کوئی بڑی مسجد نہیں ہے، مگر اب سعودی عرب اور عرب امارات کے تعاون سے بیونس آئرس میں ایک شاندار مسجد کی تعمیر کا انتظام ہو رہا ہے، پورے ملک میں سات اسلامی مراکز قائم ہیں، لیکن ان کی حیثیت زیادہ ممتاز نہیں ہے، حکومت نے اسلام کو ابھی تک سرکاری مذہب کی حیثیت نہیں دی، اور مسلمانوں کو اب بھی مجبور کیا جاتا ہے کہ اپنے نام مسیحی ناموں کے انداز پر رکھیں، عیسائیوں سے ازدواجی رشتے بھی ہوتے ہیں، سنہ [illegible]ء میں جامعہ ازہر نے یہاں اپنا ایک نمائندہ بھیجا تھا، مگر اپنی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے وہ کوئی قابل ذکر خدمت انجام نہ دے سکے، بہر حال عربی زبان سے کچھ ربط قائم ہے، بچوں کو عربی زبان پڑھائی جاتی ہے، سنہ ۲۹ء میں بیونس آئرس میں ایک اسلامی تنظیم قائم ہوئی تھی، اس کے مرکز میں ایک چھوٹی سی مسجد کتب خانہ اور ہال ہے، عربی زبان کی تعلیم کا بھی انتظام ہے، وقتاً فوقتاً اسلامی اجتماعات بھی ہوتے رہتے ہیں، اس کے علاوہ جمعیۃ عربیہ اسلامیہ کے نام سے ایک انجمن بھی قائم ہے، اور الاسلام کے نام سے ایک رسالہ بھی نکلتا ہے، اسی طرح قرطبہ شہر میں بھی ایک اسلامی سوسائٹی ہے یہ بھی سنہ [illegible]ء میں قائم ہوئی تھی، ایسی ہی ایک انجمن مندوزا میں بھی ہے، یہاں مسلمانوں کی سرگرمیاں خاصی نمایاں ہیں،

خوشی کی بات ہے کہ سعودی عرب کی مدد سے گذشتہ سال یہاں ایک اسلامی مرکز قائم کیا گیا ہے، جس کے سربراہ ندوہ اور جامعہ مدینہ کے فاضل مولانا ارشاد احمد ندوی مقرر ہوئے ہیں، امید ہے کہ اس سے آئندہ یہاں اسلامی سرگرمیوں میں بہت اضافہ ہوگا،

"ع، ص"

وفیات

مولانا فضل اللہ مرحوم

از

عبدالسلام قدوائی

معارف ابھی زیر ترتیب ہی تھا کہ مولانا فضل اللہ صاحب رحمانی کے انتقال کی اطلاع ملی مرحوم اپنے علم و فضل، تقویٰ و طہارت اور شرافت و حسن اخلاق میں سلف صالحین کا نمونہ تھے، راقم الحروف کو ان کی خدمت میں ایک مدت سے نیاز حاصل تھا جب علی گڈھ جانا ہوتا تو ان کے یہاں ضرور حاضری دیتا، اور وہ بھی پیرانہ سالی اور ضعف جسمانی کے باوجود بازدید کے لیے تشریف لاتے اور دیر تک دینی و علمی گفتگو فرماتے، میرا قیام سر سید نگر میں اپنے لڑکے ڈاکٹر محمد سالم قدوائی کے مکان بیت الفوح میں ہوتا ہے اور مولانا امیر نشان میں اپنی صاحبزادی روقیہ بیگم کے یہاں رہتے تھے، امیر نشان سے سر سید نگر کا فاصلہ اچھا خاصا ہے، میں نے کئی بار عرض بھی کیا کہ آپ اتنی تکلیف گوارا نہ کیا کریں، میں جب تک علی گڈھ میں رہوں گا خود ہی حاضر ہوتا رہوں گا، مگر انھوں نے اخلاق کریمانہ کی بنا پر میری اس درخواست کو کبھی قبول نہیں کیا، ایسی خورد نوازی کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، میں ان سے عمر میں بہت چھوٹا تھا، اور علم و فضل میں تو ان سے کوئی نسبت ہی نہ تھی بس ذرہ

بے مقدار اور وہ آفتاب علم و کمال، یہ محض ان کی بزرگانہ شفقت تھی، اور اس تعلق خاطر کا اظہار تھا، جو انھیں ندوہ کے خادموں کے ساتھ تھا، وہ ندوۃ العلما کے بانی اور ناظم اول مولانا محمد علی مونگیری کے پوتے تھے، والد کا نام مولانا احمد علی تھا، وہ علم و فضل، صلاح و تقویٰ، محاسن اخلاق اور عقل و دانش میں بہت ممتاز تھے، ان کی نوعمری کے زمانہ میں ایک طرف مشنریوں کا بڑا زور تھا جو آئے دن اسلام کے خلاف کتابیں لکھتے رہتے تھے، دوسری طرف مستشرقین علم و تحقیق کے نام پر اسلامی شریعت، سیرۃ نبوی اور تاریخ اسلام کو داغدار کر رہے تھے، اس وقت انگریزوں کے جلال و جبروت اور دبدبہ و سطوت کا یہ عالم تھا کہ ان ہرزہ سراؤں کے خلاف زبان کھولنا، اپنے کو آفات و مصائب میں مبتلا کرنا تھا، لیکن اللہ کے کچھ بندے اپنی عزت و ناموس کو خطرہ میں ڈال کر میدان میں نکل آئے، ان سرفروشوں میں مولانا محمد علی سرفہرست تھے، انھوں نے تحفۂ احمدیہ کے نام سے ایک ماہنامہ نکالا، متعدد کتابیں لکھیں، اور ابناء ملت کو دفاع اسلام کے لیے تیار کیا،

اس فضا نے مولانا احمد علی کے اندر غیرت ایمانی اور حمیت دینی کا غیر معمولی جذبہ پیدا کر دیا، وہ باپ کے دوش بدوش اس مہم میں لگ گئے، تذکرہ نگار نے ان کے جوش و ولولہ، صلاحیت کار اور اصابت رائے کا خاص طور سے ذکر کیا ہے،

جب ۱۳۱۱ھ میں مولانا محمد علی نے اپنے کام کو آگے بڑھانے کے لیے ندوۃ العلما کی داغ بیل ڈالی تو مولانا احمد علی بھی عزم و قوت کے ساتھ اس میں شریک ہوگئے،

ان کی فہم و فراست لیاقت و صلاحیت اور محنت و کارگزاری کی بنا پر ان سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں، حکیم عبدالحی صاحب اس زمانہ میں ندوہ کے ناظم تھے، اور مولانا احمد علی ان کے دست راست تھے دونوں کے درمیان فکر و خیال کا ایسا اتحاد تھا کہ ایک جان دو قالب سمجھے جاتے تھے، مولانا محمد علی نے حکیم صاحب کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان میں بڑے حسن ظن کا اظہار کیا ہے، ان کا خیال تھا کہ یہ دونوں مل کر ندوہ کو جلد بام عروج تک پہونچا دیں گے، لیکن افسوس کہ وہ ۱۳۲۶ھ میں عین عنفوان شباب کے عالم میں انتقال ہو گیا،

جس وقت مولانا احمد علی کا انتقال ہوا اسوقت مولانا فضل اللہ بہت چھوٹے تھے، دادا نے انھیں اپنی آغوش تربیت میں لے لیا، اور بڑی توجہ کے ساتھ انکی تعلیم و تربیت میں کوشش کی، اللہ نے ذہن ثاقب، طبع ارجمند اور مزاج خیر پسند عطا فرمایا تھا، مولانا محمد علی جیسے شیخ وقت کی صحبت نے ان کی ظاہری اور باطنی قوتوں کو بیدار کر دیا تھا جلد ہی علم و سلوک کے مدارج عالیہ تک پہونچ گئے، وہ مولانا محمد علی کی شفقت اور حسن توجہ کا ذکر ہمیشہ بڑی محبت و عقیدت کے ساتھ کیا کرتے تھے، کبھی کبھی راہ سلوک کے واردات بھی بیان کرتے تھے، زندگی بھر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ساتھ اذکار و اشغال کا سلسلہ بھی جاری رہا،

علوم اسلامیہ میں کتاب و سنت سے خاص تعلق تھا، قرآن مجید بڑی توجہ کے ساتھ پڑھتے تھے، اس کے رموز و اسرار اور نکات و اشارات پر ان کی گہری نظر تھی، قرآن مجید کی توضیح و تفسیر میں خاص طور سے احادیث پیش نظر رہتی تھیں، کتب حدیث میں سے یوں تو صحاح کی سبھی کتابیں مطالعہ میں رہتی تھیں،

لیکن امام بخاری کی جامع صحیح سے خاص شغف تھا، عرصۂ دراز تک پابندی کے ساتھ اس کا ایک پارہ روز پڑھتے تھے،

ادب المفرد امام بخاری کی بڑی اہم کتاب ہے، اس میں اسلامی اخلاق و آداب کا تفصیل سے ذکر ہے، اس کتاب کی کوئی شرح نہ تھی جس سے اس کی مشکلات حل کی جا سکتیں، مولانا فضل اللہ نے کئی سال کی محنت و عرق ریزی کے بعد فضل اللہ الصمد کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں اس کی شرح لکھی، اس کی وجہ سے ان کا نام ساری دنیا میں پھیل گیا، حدیث کے اساتذہ اور علماء نے اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی بڑی ثنا و صفت بیان کی، بیرون ہند کے اہل قلم نے بھی اس خدمت پر بڑی ممنونیت کا اظہار کیا،

ان کے استاد اور خسر مفتی عبد اللطیف رحمانی نے جامع ترمذی کی بارہ جلدوں میں بڑی اچھی شرح لکھی ہے، اس کام میں مولانا فضل اللہ ان کے دست راست تھے ان کے بعد انھوں نے پھر نظر ثانی کی اور بیش قیمت مفید حواشی کا اضافہ کیا، اگر یہ کتاب شائع ہو جائے تو حدیث شریف کے اساتذہ اور طلبہ کو بہت فائدہ پہنچے، مرحوم اہل علم اور اہل ثروت دونوں کو اس جانب توجہ دلاتے تھے، ان کے ایما پر معارف نے بھی ایک نوٹ لکھ کر اصحاب خیر کو اس جانب متوجہ کیا، مگر کتاب اتنی بڑی ہے اور اس کی اشاعت میں اتنا کثیر سرمایہ لگانا پڑے گا کہ کوئی ناشر تیار نہ ہوا، شرح ادب المفرد کی اشاعت میں بھی یہی دشواری تھی، مگر اللہ نے حجاز کے مشہور اہل خیر یوسف زینل علی رضا کو توفیق عطا فرمائی اور انھوں نے حدیث نبوی کے اس ذخیرہ کو بصرف کثیر شائع کر کے حسن قبول اور اجر جزیل حاصل کیا،

اگر اسی طرح جامع ترمذی کی شرح بھی کوئی اللہ کا بندہ شائع کر دیتا تو بڑا

اجر حاصل کرتا، مرحوم کے چچا مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت صوبہ بہار اگر جامعہ رحمانیہ کی طرف سے اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھائیں تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے۔

مولانا کی عمر کا کافی حصہ حیدر آباد میں گذرا، اور عثمانیہ یونیورسٹی میں عرصہ دراز تک علوم اسلامیہ کی تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، وہاں سے سبکدوشی کے بعد علی گڑھ میں قیام کیا، اور وہیں وفات پائی، تادم مرگ علم و دین کی خدمت میں لگے رہے، اور زبان و قلم سے تلقین و ارشاد کرتے رہے، اللہ تعالیٰ ان کی خدمات قبول فرمائے اور انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، اور ان کی لائق صاحبزادیوں اور دوسرے عزیزوں کو ان کے نام نیک کو بلند رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

---

[1] مولانا منت اللہ عمر میں مولانا فضل اللہ سے بہت چھوٹے ہیں، مولانا کہتے تھے کہ میں نے انھیں گود میں کھلایا ہے، مگر حقیقی چچا ہیں دوسرے چچا مولانا نور اللہ ناظم جمعیۃ علماء بہار بھی حیات ہیں، وہ بھی عمر میں چھوٹے ہیں، مولانا فضل اللہ کے والد مولانا احمد علی مولانا محمد مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے بڑے لڑکے تھے، جو ان کی پہلی حرم سے تھے،

حیات شبلی

یہ علامہ شبلی مرحوم کی محض سوانح عمری نہیں ہے، بلکہ ان کے دور کی حد تک ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی سیاسی علمی تعلیمی اصلاحی اور دوسری تحریکوں اور سرگرمیوں کی مفصل تاریخ ہے جس اجمال کے ساتھ تحریک ندوۃ العلماء کی تاریخ بھی آگئی ہے، جس کے مولانا شبلی روح رواں تھے۔

مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ۔

قیمت :- [illegible]

مطبوعات جدیدہ

دعواتِ حق (جلد اول) مرتبہ مولانا سمیع الحق صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۴۷۲ مجلد قیمت ۳۰ روپے پتہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، پشاور پاکستان

اکوڑہ خٹک (پشاور) کا دار العلوم حقانیہ پاکستان میں دار العلوم دیوبند کا مثنیٰ سمجھا جاتا ہے، درس و تدریس کے علاوہ اس کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح و تربیت بھی ہے، اس غرض سے اس کا ایک ماہانہ ترجمان "الحق" عرصہ سے نکل رہا ہے اور اب اصلاحی و دینی کتابوں کی اشاعت کے لیے موتمر المصنفین کا قیام بھی عمل میں آیا ہے، اس سلسلہ کی ابتدا دار العلوم کے بانی و مہتمم مولانا عبد الحق صاحب کے خطبات و ملفوظات کے اس مجموعہ سے کی گئی ہے، اس میں اکثر توجہ کے خطبے ہیں، ان کے علاوہ بعض تعلیمی اداروں، دعوتی اجتماعات اور مدارس کے ختم بخاری کے جلسوں کی تقریریں اور بعض سوالنموں کے جواب بھی درج ہیں، کچھ تقریریں پہلے ماہنامہ الحق میں چھپی تھیں لیکن اب مولانا کے فرزند اور الحق کے مدیر مولانا سمیع الحق نے ان کو اور دوسری تقریروں کو بارہ ابواب میں سلیقہ سے مرتب کرکے شائع کیا ہے، ان میں ایمانیات، عقائد، عبادات، اسلامی شعائر، شریعت کے اوامر و نواہی، حقوق العباد، اتحاد و اخوت اسلامی

دینی تعلیم اس کے نصاب، علماء کے فرائض، دعوت و تبلیغ کی اہمیت و ضرورت، مسلمانوں کی موجودہ ذلت و نکبت، اور اس سے نجات کی صورتوں وغیرہ مختلف امور پر اظہار خیال کیا گیا ہے، ختم بخاری کی تقریروں میں امام بخاری اور ان کی صحیح کی اہمیت و عظمت اس کی آخری حدیث کی تشریح اور شروع کی حدیث سے اس کی مناسبت پر مفید بحث ہے، ایک تقریر میں عرب و اسرائیل جنگ میں عربوں کی شکست و ہزیمت کے اسباب کا بڑے درد و کرب سے ذکر کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ کس طرح مسلمان عزت، سربلندی اور کامرانی حاصل کر سکتے ہیں، بعض تقریروں میں اسلامی حدود و تعزیرات پر اعتراض کرنے والے تجدد پسندوں اور پاکستان میں اسلامی نظام کے مخالفوں کا مدلل جواب ہے، ختم نبوت پر بحث کر کے قادیانی مذہب کی تردید کی گئی ہے اس طرح اس مجموعہ میں دین کے مختلف اعتقادی و عملی پہلوؤں اور احکام و عبادات کے اسرار و حکم کا ذکر اور ان کے متعلق شکوک و شبہات کا رد بھی ہے، انداز بیان موثر اور دل نشین ہے،

اصلاح المساجد:- مترجمہ مولانا مقتدی حسن ازہری، تقطیع متوسط، کاغذ و طباعت عمدہ، کتابت بہتر، صفحات ۳۲۰ قیمت ۱۵ روپے پتہ:- الدار السلفیہ حامد بلڈنگ، مومن پورہ، بمبئی،

مسلمان مسجد میں خدا کی عبادت کرتے، اس کو اللہ کا گھر سمجھتے اور بہت مقدس خیال کرتے ہیں، ابتدا میں یہی مسجدیں رشد و ہدایت، تبلیغ و اشاعت اور مذہبی و ملی سرگرمیوں کا مرکز بھی تھیں اس لیے ان کی ظاہری صفائی

ستھرائی کی طرح ان کی باطنی پاکیزگی و نظافت کا بھی بڑا اہتمام کیا جاتا تھا، اور ان کے اندر غلط اور خلاف شریعت کام کرنے سے بہت پرہیز کیا جاتا تھا مگر آہستہ آہستہ دوسرے شعبوں کی طرح مسلمان مسجدوں کے احترام و تقدس سے بھی غافل ہو گئے، اور ان کے اندر ایسے کام ہونے لگے جو ان کی حرمت کے منافی اور شرعاً غلط ہیں، زیر نظر کتاب میں اس قسم کے متعدد اعمال و اشغال کی نشان دہی کر کے ان کو غلط اور بدعت ثابت کیا گیا ہے اور ان کی اصلاح کی جانب توجہ دلائی گئی ہے، شروع میں بدعت کا مفہوم اور اس کے متعلق دلائل کا ذکر اور آخر میں مساجد کے فقہی احکام بیان کیے ہیں، یہ کتاب دمشق کے ایک ممتاز عالم محمد جمال الدین قاسمی (م ۱۹۱۴ء) کی تصنیف ہے، موجودہ دور کے مشہور شامی محدث محمد ناصر الدین البانی نے اس کی حدیثوں کی تخریج اور کہیں کہیں اختلافی نوٹ تحریر کیے ہیں، ترجمہ اچھا ہے، گو اس کتاب میں شام کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھا گیا ہے، لیکن اکثر بدعات و ناجائز رسوم ساری دنیا میں عام ہیں، تاہم اگر ایک ضمیمہ کا اضافہ کر کے یا ذیلی حواشی میں ان غیر شرعی طور طریقوں کا ذکر بھی کر دیا جاتا جو ہندوستانی مسجدوں میں رائج ہیں تو زیادہ بہتر ہوتا،

ہندوستانی مشرقی افریقہ میں:- (جلد اول) مرتبہ جناب کالی داس گپتا رضا صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۱۲۸ مجلد مع گرد پوش، قیمت دس روپے پچاس پیسے، پتہ:- ول پبلیکیشنز، ۱۰ جولی بھون نمبر ۱، نیو میرین لائنز، چرچ گیٹ، بمبئی،

مشرقی افریقہ میں ہندوستان کے لوگ بڑی تعداد میں آباد ہیں، یہ

لوگ پہلے وہاں تجارت کے لئے گئے، مگر جب انگریزوں کا ہندوستان پر قبضہ ہوا اور انھوں نے افریقی ملکوں کی تعمیر و ترقی کے منصوبے بنائے تو ہندوستان سے کاریگر اور مزدور وہاں لے گئے، ان میں سے بہت سے وہیں مستقل طور پر رہ گئے، جناب کالی داس رضا گپتا شعر و ادب کے شوق کے ساتھ تجارت سے بھی ذوق رکھتے ہیں، ممبئی میں ان کا اچھا کاروبار ہے، اس سلسلہ میں وہ برسوں افریقہ میں رہے ہیں، اور وہاں کے حالات کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے اس کتاب میں انھوں نے مشرقی افریقہ میں آباد بعض ممتاز ہندوستانی افراد کے حالات و واقعات زندگی قلمبند کرکے وہاں کی تعمیر و ترقی میں ان کی خدمات دکھائی ہیں اور افریقہ کے مختصر تاریخی و جغرافیائی حالات اور ہندوستانیوں کے وہاں پہونچنے کی سرگذشت بیان کی ہے، یہ اس کتاب کی پہلی جلد ہے، دوسری جلد میں افریقہ میں اردو کی ترویج و اشاعت کا ذکر ہوگا۔

سفینۂ نجات :- از جناب ابو نجمہ صوفیؔ علوی صاحب، متوسط تقطیع کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۴۳، قیمت پندرہ روپئے، پتہ از مصنف معرفت نیو سلور بک ایجنسی، وزیر بلڈنگ کمپاؤنڈ بمبئی۔

جناب ابو نجمہ صوفیؔ علوی صاحب ایک معمر اور صوفی مشرب شاعر ہیں، ان کے دل میں دین و ملت کا درد اور اسلام و داعی اسلام علیہ السلام کی سچی محبت ہے، اس لئے نعت و منقبت رسول ان کی شاعری کا خاص موضوع ہے، وہ اسے اپنی مغفرت اور نجات کا وسیلہ خیال کرتے ہیں، نظموں میں مسلمانوں کی موجودہ پستی بے عملی، باہمی اختلاف و فرقہ آرائی کی مذمت اور واعظوں، لیڈروں اور شاعروں

کی شیوہ بیانی پر طنز آمیز افسوس ظاہر کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو ان کی گذشتہ شوکت و عظمت یاد دلاکر اپنا مستقبل تابناک بنانے کی دعوت دی گئی ہے، صوفیؔ صاحب کو تغزل سے بھی مناسبت ہے، اس میں عشق و محبت کی حرارت کے ساتھ جذبات و خیالات کی پاکیزگی بھی ہے، مگر کہیں کہیں کلام میں خامی و ناہمواری ہے، جیسے ع گھٹا رحمتوں کی ستاروں میں مہکی اصنام، گھٹا برستی ہے مہکتی نہیں، ایک جگہ فرماتے ہیں ع کیوں نہ آنکھوں پہ صحابہ کے رکھوں نقش قدم اصنام، نقش قدم آنکھوں پر نہیں سامنے رکھا جاتا ہے، ہاں خاک قدم آنکھوں پر رکھی جاتی ہے، اسی صفحہ پر برق کی انگڑائی بھی لکھی ہے، جو صحیح نہیں ہے، ان کا ایک اور مصرع ہے ع جلال تیغ مومن پر فلک کا دل بھی لرزاں ہے [illegible] ابر کے بجائے سے کہنا چاہیے تھا، بعض جگہ طرز ادا کی خامی سے شعر مبہم ہو گیا ہے مثلاً

سرمایہ مری زیست کا یہ کم تو نہیں ہو   کافی غم احمدؐ ہے کوئی غم تو نہیں ہے ۱۲۳

تیری زلفوں کا سنورنا کوئی آسان نہ تھا   اپنی تقدیر کے بل ہم سے نکالے نہ گئے ۲۱۸

صنف انشائیہ اور انشائیے :- مرتبہ ڈاکٹر سید محمد حسنین صاحب، متوسط تقطیع کاغذ عمدہ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۲۹۴، قیمت عہ روپئے (۱) موتی لال بنارسی داس ام۔ یو۔ اے بنگلہ روڈ جواہر نگر، دہلی نمبر ۷ (۲) موتی لال بنارسی داس چوک، وارانسی (۳) موتی لال بنارسی داس اشوک راج پتھ، پٹنہ نمبر ۴ (۴) پربلی کیشن، جگ جیون روڈ گیا۔

انشائیہ اردو ادب کی ایک مقبول اور دلچسپ صنف ہے، اس کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں، زیر نظر مجموعہ علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر سید محمد

حسین نے مرتب کیا ہے، اس کے کئی مجموعے پہلے شائع ہو چکے ہیں، یہ چوتھا اڈیشن ہے، جو تین حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ "نقش قدیم" میں (۱) محمد حسین آزاد (۲) خواجہ حسن نظامی (۳) عبدالحلیم شرر (۴) مرزا فرحت اللہ بیگ اور (۵) ملا رموزی کے انشائیے اور دوسرے حصہ "نقش نو" میں رشید احمد صدیقی، حاجی لق لق، انجم مان پوری، پطرس بخاری، عبدالعزیز فلک پیما، کرشن چندر، کنھیا لال کپور اور شوکت تھانوی کے انشائیے شامل ہیں، آخری حصہ "نقش جدید" موجودہ دور کے نو ادیبوں کے انشائیوں پر مشتمل ہے، مندرجہ بالا ناموں کی کشش سے سب کو اس مجموعہ کے پڑھنے کا اشتیاق ہوگا، شروع میں فاضل مرتب کے قلم سے ایک دلچسپ مقدمہ بھی ہے، اس میں انشائیے کی نوعیت و خصوصیت اور فنی آداب و لوازم پر سیر حاصل گفتگو کر کے دوسرے اصناف ادب سے اس کا فرق واضح کیا گیا ہے،

اردو اور قومی ایکتا مرتبہ جناب قیوم خضر صاحب تقطیع متوسط، کتابت طباعت قدرے بہتر، صفحات ۷۰، قیمت دس روپیے، پتہ: دفتر اشارہ، پٹنہ نمبر۴

یہ کتاب اردو کے بارہ میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کو رفع کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، اس میں اس کی گذشتہ تاریخ بیان کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی، اور یہیں کے لوگوں کی زبان ہے، ہندو مسلمان سب اسکے فروغ میں شریک رہے ہیں، یہ قومی یکجہتی کی علامت ہے، آزادی کی تحریک میں اسکا حصہ رہا ہے، اردو اور ہندی کا جھگڑا انگریزوں نے پیدا کیا ہے، اردو رسم الخط کی تبدیلی کا مطالبہ سراسر مہمل بلکہ مضر ہے، آخر میں اردو کی ترقی کے لئے بعض مفید مشورے دیے ہیں، آزادی کے بعد اس مسئلہ پر بہت لکھا گیا ہے مگر یہ گتھی سلجھنے کے بجائے برابر الجھتی جا رہی ہے، کیونکہ جب تک دل نہیں بدلتے دلیل و حجت کام نہیں دے سکتی، "ض"